وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ

وفاق المدارس ملتان

جلد نمبر ۱۹ شمارہ نمبر ۱۰ شوال المکرم ۱۴۴۳ھ مئی ۲۰۲۲ء

بیاد

شمس العلماء
حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ العلماء
حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

محدث العصر
حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

مفکر اسلام
حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ

جامع المعقول والمنقول
حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس المحدثین
حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

استاذ المحدثین
حضرت مولانا عبد الرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ

سرپرست

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

شیخ الحدیث حضرت مولانا انوار الحق حقانی مدظلہم
سینئر نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر اعلیٰ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم
ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر

مولانا محمد احمد حافظ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

وفاق المدارس العربیہ پاکستان گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

فون نمبر 27-6514525-6514526-061 فیکس نمبر 061-6539485

Email:wifaqulmadaris@gmial.com web:www.wifaqulmadaris.org

ناشر: حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری ◉ مطبع: اقرا اختر پرنٹنگ پریس پرانی غلہ منڈی بوہڑ گیٹ ملتان

شائع کردہ: مرکزی دفتر وفاق المدارس العربیہ گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

دینی مدارس میں تزکیہ وسلوک کی مجالس	کلمۃ المدیر	۳
مدرسہ دیوبند کا فکری اور عملی منہج	مولانا مفتی طارق محمود	۹
ایک استاذ.....ایک شاگرد	مولانا فخر الاسلام مدنی	۲۰
درس وتدریس کی اہمیت اور اکابر کا طرز	مولانا مفتی سید عبد القدوس ترمذی	۲۵
علماء اور مدارس عبادت کے ذرائع ہیں	مولانا شاہ عالم گورکھپوری	۳۹
فضلاءِ کرام کی خدمت میں چند گزارشات	شیخ الحدیث مولانا زبیر احمد صدیقی	۴۳
حافظ خلف بن سالم رحمۃ اللہ علیہ	جناب حافظ محمد اسماعیل	۴۹
مولانا مفتی محمود اشرف عثمانیؒ	مولانا محمد ناظم اشرف عثمانی	۵۲
ذرا سی احتیاط.....فوائد بے شمار	مولانا منظور احمد آفاقی	۵۶
''تلخیص البیان''، ایک اہم تفسیری کاوش	مولانا مفتی محمد حنیف خالد	۵۹
تبصرۂ کتب	محمد احمد حافظ	۶۲

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر- سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر- ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر-

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: 30 روپے، زر سالانہ مع ڈاک خرچ: 360 روپے

دینی مدارس میں تزکیہ وسلوک کی مجالس

ضرورت، اہمیت اور افادیت

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

قرآن مجید میں کم از کم چار مقامات پر ایک ہی اسلوب میں اللہ رب العزت نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت ورسالت کے چار اہم پہلو بیان فرمائے ہیں:

۱.....رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْم (البقرہ:۱۲۹)

۲.....كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْن (البقرہ:۱۵۱)

۳.....لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْن (آل عمران:۱۶۴)

۴.....هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ق وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْن (الجمعہ:۲)

.....کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ کی آیات پڑھتے ہیں، اپنی امت کا تزکیہ کرتے ہیں، کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہیں، اور انہیں حکمت ایمانی سکھاتے ہیں۔ چاروں مقامات پر تعلیم کتاب وحکمت کے ساتھ 'تزکیہ' کا ذکر ہے؛ جس سے تعلیم کے ساتھ تزکیہ نفوس کا تلازم معلوم ہوتا ہے۔

علماءِ امت؛ جو وارثین علوم نبوت ہیں وہ اس آیت کے مصداق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں ان چاروں امور کی انجام دہی کے مکلّف ہیں۔

بلاشبہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد نفوس انسانی کا تزکیہ بھی ہے۔ جس کو اصطلاح میں سلوک وتصوف بھی قرار دیا گیا ہے۔ اوّل دور میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ صحبت سے اپنے قلوب کو مجلّٰی اور اپنے ظاہر وباطن کو مزکّٰی کیا۔ دور نبوت کے بعد تابعین کرام نے

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبتیں اٹھائیں، تابعین سے تبع تابعین نے فیض پایا..... یوں چراغ سے چراغ جلتا گیا۔

پھر زمانہ جوں جوں دور نبوت سے دور ہوتا چلا گیا اس بات کی ضرورت بڑھتی گئی کہ مشائخ کرام دائرہ شریعت میں رہتے ہوئے تزکیہ وسلوک کے خاص افعال واشغال انجام دیں۔ چناں چہ اس سلسلے میں مشائخ نے بے پناہ محنتیں، ریاضتیں اور مجاہدے کیے، امت کو تزکیہ وسلوک کا بے غبار نظام دیا۔ وہ طالبینِ حق کو.....حسد، بغض، کینہ، ریا، کبر، عجب، غیبت، جھوٹ، حب دنیا، حب جاہ ومال اور دوسرے رذائل سے پاک کرتے، اور انہیں خدا طلبی، محبتِ رسول، اتباعِ سنت، زُہد، توکل، انابت وخشیت، تسلیم ورضا، صدق وراستی، تواضع، انکساری، صلہ رحمی کا پیکر بناتے۔

تزکیہ وتطہیر قلوب اور تہذیبِ اخلاق واعمال کی ضرورت تو ہر دور میں مسلّم رہی ہے۔ ہمارے اسلاف علماء کرام نے کبھی اس سے اعراض نہیں برتا، وہ محض علم کے منبع نہیں ہوتے تھے بلکہ سلوک واحسان کی وادیوں کے رمز شناس بھی ہوتے تھے۔ ہمارے مدارس بھی نری تعلیم گاہیں نہ تھیں بلکہ وہ غیر رسمی خانقاہیں بھی ہوتی تھیں۔ اساتذہ وطلبہ ایک خاص ایمانی رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور مہتمم سے لے کر چوکیدار تک سب کے سب صاحب نسبت لوگ ہوتے تھے۔ پھر اس دارالعلوم سے پھوٹنے والی شاخوں میں بھی یہ رنگ نمایاں تھا۔ اساتذہ کی اکثریت کسی نہ کسی صاحب نسبت اللہ والے سے وابستہ ہوتی تھی، درجات علیا کے اساتذہ تو اپنی ذات میں شیخ طریقت اور صاحب ارشاد بھی ہوتے۔ مدارس میں ان کا مبارک اور نورانی وجود طالبین کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتا تھا، یہی دینی مدارس کی اصل روح تھی۔

پاکستان کے معروف دینی مدارس میں .....مثلاً: جامعہ اشرفیہ لاہور میں مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا محمد مالک کاندھلویؒ، مولانا صوفی محمد سرورؒ.....جامعہ خیر المدارس ملتان میں مولانا خیر محمد جالندھریؒ، مولانا مفتی محمد عبداللہ ملتانیؒ، مولانا مفتی عبدالستارؒ، مولانا منظور احمدؒ، مولانا سید قمر الدین شاہؒ .....جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی میں مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ.....دارالعلوم کراچی میں مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، مولانا سبحان محمودؒ.....جامعہ فاروقیہ کراچی میں مولانا سلیم اللہ خانؒ .....دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں مولانا عبدالحق حقانیؒ، دارالعلوم کبیر والا میں مولانا مفتی عبدالقادرؒ.....باب العلوم کہروڑ پکا میں مولانا عبدالمجید لدھیانوی.....جامعہ حقانیہ ساہیوال میں مولانا سید عبدالشکور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ.....جیسے اصحابِ علم وفضل نہ صرف تزکیہ وسلوک کی وادیوں کے شناور تھے بلکہ ان کے دم قدم سے روحانی مجالس بھی قائم رہتی تھیں۔ علماء وطلبہ اور عامۃ الناس ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے اور حاضر ہوکر اپنے پیاسے دلوں کو سیراب کرتے۔ مگر اس بات کے اعتراف میں کچھ مضائقہ نہیں کہ اب ہمارے مدارس میں یہ

رنگ کافی حدتک پھیکا پڑچکا ہے ۔ وہ پہلے کی جیسی سرگرمی باقی نہیں رہی ؛ حالانکہ آج ہی کے دور میں ان مجالس رُشدوہدایت کی اشدضرورت تھی۔

آج جبکہ موّاج فتنوں ،عقلی اشکالات،الحادی نظریات ،شیطانی خرافات اور مغربیت کی یلغار ہے،طغیان وعصیان بے قابوہوچکے ہیں،دہریت کی مسموم اورتندوتیز ہوائیں ہمارے مدارس کی چاردیواری میں بھی لپک لپک کرداخل ہورہی ہیں،بظاہرایک چھوٹے سے آلے موبائل فون میں اخلاق واعمال اورعقائدونظریات کے بگاڑ کی ہرشےموجود ہے۔ ہمارے مدارس کے طلبہ کرام سوشل میڈیا کے اس سیلابِ بلا میں بہتے نظرآرہے ہیں۔درسی سال اختتام کوپہنچتا ہےتوطلبہ کودنیاطلبی اور مادیت پرستی کی طرف دعوت کی باقاعدہ آوازیں لگنےلگتی ہیں۔

اکابرعلماء کرام اوراساتذہ واضح طور پرمحسوس کرنے لگے ہیں کہ طلبہ میں نہایت تیزی سےقلبی سکون اورذہنی یکسوئی ناپیدہورہی ہے،دلوں کی پراگندگی میں اضافہ ہورہاہے،اس کالازمی نتیجہ تعلیم میں بےتوجہی اورامتحانات میں راسب طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد ہے۔ایسے میں اس طرح کی مجالس کی ضرورت ازحد بڑھ چکی ہے۔

یہ حقیقت ضرورپیش نظررہنی چاہیے کہ یہ مدارس ہی ہیں جہاں سے تمام دینی شعبوں اوراسلامی تحریکوں کو بنیادی ایندھن فراہم ہوتا ہے ۔مفتیان کرام ،علماءعظام ،اساتذہ،خطباء، ائمہ مساجد،داعیان دین ،اسلامی جماعتوں کی قیادت اسی ٹکسال سے ڈھل کے نکلتے ہیں،اس لیے مدرسہ کا ماحول خاص اہمیت کا حامل ہے۔

دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی کثیرتعداد مدارس میں رہائش اختیارکرتی ہے، ان کی تربیت کا بہترین زمانہ اور وقت مدرسہ کے سپرد ہوتا ہے،اس دوران نوجوان طلبہ کےمختلف قلبی تقاضوں ،ذہنی رجحانات اور میلانات کا خیال رکھنا اورنگرانی کرنا بھی ضروری ہے،گرفت کمزور ہوجائے توکسی بھی وقت کوئی ناپسندیدہ رجحان زندگی کے دھارے کوغلط رخ پرڈال سکتا ہے۔فکری گمراہی،عملی خرابی اوراخلاقی بےراہ روی کے چھینٹے دامنِ حیات کو داغ دارکرسکتے ہیں۔

مدارس کا نظامِ تربیت اس پہلو سے قابل توجہ ہے جس کے لیے خانہ پوری کرنے والے اساتذہ کی نگرانی کافی نہیں، بلکہ ایسے صاحب دَردِاساتذہ کی ضرورت ہے جن میں اخلاص ہو،للّٰہیت ہو،تقویٰ وخشیت ہو، جو سینے میں شفقت سے معمور دل رکھتے ہوں اور جوطلبہ کوبچوں اورچھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتے ہوں۔ پہلے کے اساتذہ اپنے اس منصب سے غافل نہیں ہوتے تھے،وہ طالب علم کے اخلاق واعمال کی نگرانی کرتے،غلطی پرٹوکتے ،بےراہ روی سے روکتے اور طالب علم کوعلم کے حصول کے ساتھ عمل پر بھی ابھارتے تھے۔اس سب سے بڑھ کر ان کا اپنا کردار،رویہ اور برتاؤ ایسا ہوتا کہ وہ خودطلبہ کے لیےمشعل راہ بن جاتے۔

ہمارے اکابر اول روز سے اس سلسلے میں فکر مند رہے ہیں، جہاں کہیں کوتاہی نظر آئی اس کی نشاندہی کی، چناں چہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یہ چیز بالکل صحیح ہے کہ قدیم زمانہ میں مدرسہ ہی خانقاہ ہوتا تھا، جس کے اوپر تعلیم کا پردہ تھا، نام تو نہیں آتا تھا کہ ہم تصوف سکھا رہے ہیں، طریقت سکھا رہے ہیں، لیکن ان بزرگوں کا طرز عمل، ان کا کردار، کیریکٹر وہ تھا کہ ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر خود بخود اخلاق درست ہو جاتے تھے، تو اب ظاہر بات ہے کہ کچھ تو اساتذہ میں بھی کمی ہے اور کمی کی بناء پر جو کچھ بھی ہو مگر صورتحال یہ ہے کہ عام طور پر اساتذہ کی تکمیل اور تزکیہ اخلاق کی طرف توجہ نہیں ہے، جتنے نئے اساتذہ ہیں ان کی توجہ ادھر نہیں ہے۔'' (البلاغ: صفر المظفر: ۱۴۳۹ھ)

ہمارے اکابر میں قطب الارشاد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا قدس سرہ العزیز کے تخیلات اور توقعات کا مسکن ہی مدرسہ بن گیا تھا، آپ کی ''آپ بیتی'' آپ کے مکتوبات اور مضامین میں جابجا مدارس کے نظام کے حوالے سے دلی کڑھن اور تشویش آشکارا ہوتی ہے۔ آپؒ نے محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ کے نام اس سلسلے میں ایک طویل مکتوب ارسال فرمایا جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''مدارس کے روز افزوں زوال، طلبہ کی دین سے بے رغبتی، بے توجہی اور لغویات میں اشتغال کے متعلق کئی سال سے میرے ذہن میں یہ ہے کہ مدارس میں ذکر اللہ کی بہت کمی ہوتی جارہی ہے، بلکہ معدوم، بلکہ اس لائن سے تو بعض میں تنفر کی صورت دیکھتا ہوں، جو میرے نزدیک بہت خطرناک ہے، ہندوستان کے مشہور مدارس دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم، شاہی مسجد مراد آباد، وغیرہ کی ابتداء جن اکابر نے کی تھی وہ سلوک میں امام الائمہ تھے، ان ہی کی برکات سے یہ مدارس ساری مخالف ہواؤں کے باوجود اب تک چل رہے ہیں۔ میں اس مضمون کو کئی سال سے اہل مدارس، منتظمین اور اکابرین کی خدمت میں تحریراً اور تقریراً کہتا اور لکھتا رہا ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ آپ جیسے حضرات اس کی طرف توجہ فرمائیں تو مفید اور مؤثر زیادہ ہوگا، مظاہر العلوم میں تو میں کسی درجہ میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا ہوں اور دار العلوم کے متعلق جناب الحاج قاری محمد طیب صاحب سے بار بار تقریراً و تحریراً عرض کر چکا ہوں اور بھی اپنے سے تعلق رکھنے والے اہل مدارس کو متوجہ کرتا رہتا ہوں، مدارس کے روز افزوں فتنوں سے بہت ہی طبیعت کو کلفت پہنچتی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ فتنوں سے بچاؤ کی صورت صرف ذکر اللہ کی کثرت ہے، جب اللہ کا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا تو دنیا ختم ہو جائے گی، جب اللہ تعالیٰ کے پاک نام میں اتنی قوت ہے کہ ساری دنیا کا وجود اسی سے قائم

ہے تو مدارس بے چارے ساری دنیا کے مقابلہ میں دریا کے مقابلہ میں قطرہ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو ان کی بقاء اور تحفظ میں جتنا دخل ہوگا وہ ظاہر ہے، اکابر کے زمانہ میں ہمارے یہ جملہ مدارس میں اصحاب نسبت وذاکرین کی کثرت جتنی رہی ہے وہ آپ سے مخفی نہیں اور اب اس میں جتنی کمی ہوگئی ہے، وہ بھی ظاہر ہے، بلکہ اگر یوں کہوں کہ اس پاک نام کے مخالف حیلوں بہانوں سے داخل ہوتے جارہے ہیں، تو میرے تجربہ میں غلط نہ ہوگا۔ اس لیے میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں کچھ ذاکرین کی تعداد ضرور ہوا کرے، طلبہ کے ذکر کرنے کے تو ہمارے اکابر بھی خلاف رہے ہیں، اور میں بھی موافق نہیں، لیکن منتہی طلبہ یا فارغ التحصیل یا اپنے سے یا اکابرین سے تعلق رکھنے والے ذاکرین کی کچھ تعداد مدارس میں علی التبادل ضرور ہوا کرے اور مدرسہ ان کے قیام کا کوئی انتظام کردیا کرے، مدرسہ پر طعام کا بار ڈالنا تو مجھے بھی گوارا نہیں کہ طعام کا انتظام تو مدرسہ کے اکابر میں سے کوئی شخص ایک دو اپنے ذمہ لے لے یا باہر سے مخلص دوستوں میں سے کسی کو متوجہ کر کے ایک ایک ذاکر کا کھانا اس کے حوالہ کردے جیسا کہ ابتداء میں مدارس کے طلبہ کا انتظام اسی طرح ہوتا تھا، البتہ اہل مدارس ان کے قیام کی کوئی صورت اپنے ذمہ لے لیں، جو مدرسہ میں ہو اور ذکر کے لیے کوئی ایسی مناسبت شکل تجویز کریں کہ طلبہ کا کوئی حرج نہ ہوں نہ سونے والوں کا، نہ مطالعہ کرنے والوں کا۔ لہٰذا میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں دو چار ذاکرین مسلسل ضرور رہیں کہ داخلی اور خارجی فتنوں سے بہت سے امن کی امید ہے، ورنہ مدارس میں جو داخلی وخارجی فتنے بڑھتے جارہے ہیں، اکابر کے زمانے سے جتنا بُعد ہوتا جائے گا ان میں اضافہ ہی ہوگا۔''

(اقراء ڈائجسٹ، قطب الاقطاب شیخ الحدیث نمبر، طبع جدید ستمبر ۲۰۲۰ء، دارالاشاعت کراچی)

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ دینی مدارس میں نہ صرف اس ضرورت پر توجہ دلاتے ہیں بلکہ عملی تجاویز بھی بتاتے ہیں؛ آپ فرماتے ہیں:

''یہی حال تصوف اور اخلاق کا ہے کہ اس کو باقاعدہ درس میں اس لیے شامل نہیں کیا گیا کہ مدارس کا ماحول بذات خود اخلاق وطریقت کی عملی تربیت کرتا تھا، اور باقی ماندہ کسر ذاتی مطالعہ اور کسی مرشد کے تعلق سے پوری ہوجاتی تھی؛ لیکن اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف اور اخلاق کی کتب باقاعدہ داخل درس ہوں، اس مقصد کے لیے حضرت امام غزالی کی ''ہدایۃ الہدایۃ'' اور ''اربعین'' ''احیاء العلوم'' کے منتخب حصے، حضرت امام سہروردی کی ''عوارف المعارف''، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی ''الکشف'' اور ''التشرف'' وغیرہ مختلف درجات میں رکھی جاسکتی ہیں۔'' (درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھیں اور پڑھائیں: ۵۳)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''مدارس کے نصاب ونظام کا جائزہ لیتے وقت ہمارے نزدیک سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ مدارس کی روح کے احیاء کی فکر کی جائے، اس روح کے احیاء کا تعلق اصل میں تو اہل مدارس کی قلبی لگن سے ہے، لیکن اس سلسلے میں چند عملی تجاویز درج ذیل ہیں:

۱.....تمام مدارس میں تصوف واحسان کو باضابطہ نصاب کا جزء بنایا جائے۔

۲.....اساتذہ وطلبہ پر لازم ہے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ جمع ہوکر بزرگانِ دین اور بالخصوص اکابر علمائے دیوبند کے حالات وملفوظات کا اجتماعی طور پر مطالعہ کریں، اس میں حضرت تھانویؒ کی ''ارواح ثلاثہ''، ''تذکرۃ الرشید''، ''حیات قاسمی''، ''تذکرۃ الخلیل''، ''حیات شیخ الہند''، ''اشرف السوانح'' اور حضرت شیخ الحدیثؒ کی ''آپ بیتی'' کا اجتماعی مطالعہ خاص طور پر مفید ہوگا۔

۳.....ہر مدرسہ کے اساتذہ اور مہتممین کے لیے کسی شیخ طریقت سے باقاعدہ اصلاحی تربیت کا تعلق قائم کرنا ضروری سمجھا جائے اور اساتذہ کے تقرر اور ترقی وغیرہ میں ان کے اس پہلو کو بطورِ خاص نظر میں رکھا جائے۔

۴.....جس مدرسہ کے قریب کوئی صاحب ارشاد بزرگ موجود ہوں وہاں کے اساتذہ اور طلبہ ان کی صحبت وخدمت غنیمت کبریٰ سمجھ کر اختیار کریں اور کبھی کبھی مدرسے میں ان کی اجتماعی وعظ ونصیحت کا اہتمام کیا جائے۔'' (درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھیں اور پڑھائیں؟، ص:۴۷، مکتبۃ السعد کراچی)

یہ طلبہ ہمارے ہاتھوں میں ''کالمیت فی ید الغسال'' کے درجے میں ہیں، خیر خواہی، دلسوزی، حکمت اور اخلاص کے ساتھ ان عزیز طلبہ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آج جبکہ زمانے کی رفتار نہایت تیز ہوچکی، اخلاق کو پراگندہ کرنے اور ذہنوں کو ورغلانے کے اسباب عام ہوچکے ہیں، دینی مدارس کے طلبہ کو صلاح وفلاح سے دور کرنے، انہیں اسلاف کی راہ سے ہٹا کر 'جدید تقاضوں' کے پیچھے لگانے کے لیے باقاعدہ انجمنیں اور سوسائٹیاں وجود میں آچکی ہیں، ایسے دور میں دینی مدارس میں نظام تربیت اور تزکیہ وسلوک کی اہمیت پہلے سے بڑھ کر ہے.....یقیناً یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے اپنے دین پر یقین واذعان اور اعتماد پیدا کرکے اسلاف بیزاری، آزادرَوی اور فتنوں کی یلغار کو روکا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ہمارے اکابر علماء نے جو لائحہ عمل تجویز فرمایا ہے اس سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے؛ اور اپنے مدارس میں اسے رائج کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو.....آمین بحرمۃ سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم۔ ☆☆

مقالات ومضامین

مدرسہ دیوبند کا فکری اور عملی منہج

قسط نمبر:۱

مولانا مفتی طارق محمود

۱۸۵۷م کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جب برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا، اور حالات سے یقین ہو چلا کہ اسلام کا چمن اب اجڑا اور یہ کہ ہندوستان بھی اسپین کی تاریخ دہرانے کے لیے تیار ہو چکا ہے، تو مسلمانوں کے دین کے تحفظ کے لیے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/ ۳۰ مئی ۱۸۶۷م کو دیوبند میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی گئی۔ جسے آج دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانا جاتا ہے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند: ص ۱۲، ۱۴ ملخصا، دارالاشاعت، کراچی، سنہ ندارد) زیر نظر مقالے میں اسی درسگاہ کا بنیادی تعارف درج ذیل ۱۲ نکات میں ملاحظہ فرمائیں: ۱: دیوبندی دراصل تعلیمی ادارے کی طرف نسبت ہے۔ ۲: عقیدہ اور کلام میں معتدل طرز فکر۔ ۳: حدیث وفقہ میں متوازن طریقہ۔ ۴: تصوف اور تزکیہ کا اہتمام۔ ۵: دین کے دفاع کی طرف خصوصی توجہ۔ ۶: تدریس وافتاء۔ ۷: دعوت وارشاد۔ ۸: تصنیف وتالیف۔ ۹: سیاسیات میں شرکت۔ ۱۰: استغناء اور توکل۔ ۱۱: متفرق تعلیمی خصوصیات: ا: کتاب وار نظام تعلیم۔ ب: طریق درس۔ ج: امتحان۔ د: مادری زبان میں تعلیم۔ ھ: خالص دینی تعلیم۔ و: بقدر ضرورت معقولات کی تعلیم۔ ۱۲: ختامہ مسک۔

۱: دیوبندی دراصل تعلیمی ادارے کی طرف نسبت ہے:

علمائے دیوبند یا جماعت دیوبند کی یہ نسبت دیوبندیت یا قاسمیت کوئی وطنی یا قومی یا فرقہ واری نسبت نہیں، بلکہ صرف ایک تعلیمی نسبت ہے جو مقام تعلیم (دیوبند) یا مدار روایت شخصیت حضرت قاسم العلوم کی نسبت سے (دیوبندی یا قاسمی) معروف ہوگئی ہے، جس سے اس جماعت کا تعلیمی انتساب اور اسکی روایت ودرایت کا استناد واضح ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فضلا علیگ کے لقب سے، یا جامعہ ملیہ دہلی کے فضلا جامعی کے نام سے، یا مظاہر علوم کے فضلاء مظاہری کے نام سے۔ علمائے دیوبند اپنے دینی رخ اور مسلکی مزاج کے لحاظ سے کلیۃً اہل السنّت والجماعت ہیں، نہ وہ کوئی نیا فرقہ ہے، نہ نئے عقائد کی کوئی جماعت ہے۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص ۲۲، ۲۳، ادارہ اسلامیات، لاہور، ط: اول، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸م)

۲: عقیدہ اور کلام میں متوازن طرز فکر:

قال مولانا الشيخ خليل احمد السهارنفوری: إنا – بحمدالله ومشائخنا رضوان الله عليهم أجمعين وجميع طائفتنا وجماعتنا – مقلدون لقدوة الأنام وذروة الإسلام الإمام الهمام

الإمام الأعظم أبی حنیفة النعمان رضی الله تعالی عنه فی الفروع، ومتبعون للإمام الهمام أبی الحسن الأشعری والإمام الهمام أبی منصور الماتریدی رضی الله عنهما فی الاعتقاد والأصول، ومنتسبون من طرق الصوفیة إلی الطریقة العلیة المنسوبة إلی السادة النقشبندیة، والطریقة الزکیة المنسوبة إلی السادة الجشتیة، وإلی الطریقة البهیة المنسوبة إلی السادة القادریة، وإلی الطریقة المرضیة المنسوبة إلی السادة السهروردیة رضی اللّٰه عنهم أجمعین (المهند(المترجم) :ص ۲۹، ۳۰،ادارہ اسلامیات،لاهور ط: ۱۴۰۴/۱۹۸۴)

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: ہم اور ہمارے مشائخ اور ہماری ساری جماعت بحمداللہ فروعات میں مقلد ہیں مقتدائے خلق حضرت امام ہمام امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ،اوراصول واعتقادات میں پیرو ہیں امام ابوالحسن اشعری اورامام ابومنصور ماتریدی رضی اللہ عنہما کے۔اورطریقہائے صوفیہ میں ہمیں انتساب حاصل ہے سلسلہ عالیہ حضرات نقشبندیہ،اورطریقہ زکیہ مشائخ چشت اورسلسلہ بہیہ حضرات قادریہ اورطریقہ مرضیہ مشائخ سہروردیہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ۔

قال الامام الشیخ أنورشاه الکشمیری رحمه الله تعالی: أثبت شیء فی هذا الباب (أی فی معتقد الأئمة الحنفیة) عقیدة الطحاوی، وأحسن شروحه شرح القونوی.(فیض الباری مع البدر الساری : ۱/۱۳۴،دار الکتب العلمیة ،بیروت،ط: ۱۴۲۶)

حضرت مولانا انورشاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ائمہ حنفیہ کے عقیدے کے بارے میں سب سے زیادہ قابل اعتماد دستاویز عقیدہ طحاویہ ہے۔اوراس کی سب سے عمدہ شرح قونوی کی ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: دیوبندیت کوئی مستقل مذہب نہیں۔سلف اور جمہور اہل سنت و الجماعت کے مکمل اتباع ہی کا نام دیوبندیت ہے۔جوعقیدہ جمہور اہل سنت والجماعت کے خلاف ہے، وہ دیوبندیت کے بھی خلاف ہے۔(حیات انبیائے کرام:ص۶۰،المکتبۃ الاشرفیہ، جامعہ اشرفیہ،لاہور، ط: سنہ ندارد)

اورفرماتے ہیں: ''بے کم وکاست ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کتب عقائد اہل السنّت والجماعت کو دیکھ لیجیے، جوعقائدان تمام کتابوں میں صراحت کے ساتھ مذکور ہیں علمائے دیوبند انھیں عقائد کے زبردست حامل اوران کے خلاف کرنے والوں کی تردید میں پیش پیش ہیں''۔(المہند (مترجم):ص۱۷۵)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حضرات متکلمین نے حق تعالی کی ذات وصفات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ درحقیقت اہل بدعت والحاد کی مدافعت ہے۔اس کو علمی اصطلاح میں صرف منع (احتمال ظاہر کرنے)

کے درجے میں رہنا چاہیے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسی صورت ہو تو یہ ممکن اور محتمل ہے، محال نہیں۔ یہ نہیں کہ واقع میں عنداللہ ایسا ہی ہے، مگر ہو یہ گیا کہ متاخرین متکلمین بجائے مانع بننے کے مدعی بن بیٹھے، اور اپنے پیدا کیے ہوئے احتمالات کو اسلام کے عقیدہ کا درجہ دے دیا۔ اس لیے میں تو یہ کہتا ہوں کہ علم کلام کو صرف مدافعت اہل بدعت اور منع اصطلاحی یعنی احتمال و امکان کے درجے میں رکھنا چاہیے، اور عقائد کو مثل سلف صالحین کے ان مباحث سے سادہ رکھنا چاہیے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۴/۱۵۹، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۲ھ، اور دیکھیے: ملفوظات حکیم الامت: ۲۶/۷۲، ط: ۱۴۲۵ھ اور ۲۶/۲۳۲، ط: ۱۴۲۵ھ)

اور فرماتے ہیں: ایک غیر مقلد صاحب کی عنایت سے ایک رسالہ اور لکھنا پڑا ''تمہید الفرش فی تحدید العرش''، جس میں استواء علی العرش کی بحث ہے، گو صفات کے باب میں کلام کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے، اس سے ہمیشہ میں خود بھی منع کرتا ہوں اور اپنے بزرگوں کو بھی اس سے بچتے دیکھا ہے۔ باقی متقدمین نے جو اس میں کچھ کلام کیا ہے وہ منع کے درجہ میں تھا، متأخرین نے دعوی کے درجہ میں کر لیا اور اب تو اس میں بہت ہی غلو ہو گیا، بلا ضرورت کلام کرنے کو میں خود بدعت سمجھتا ہوں، مگر بضرورت کلام کرنا پڑتا ہے، سلف کا یہی عمل تھا۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۶/۱۰۱، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۹ھ) رسالہ تمہید الفرش فی تحدید العرش، آیات صفات کے غامض مبحث میں انتہائی شاندار تحقیق ہے۔ (دیکھیے: امداد الفتاوی: ۶/۲۶- ۶۲، مکتبہ دار العلوم کراچی، ط: ۱۴۳۱ھ)

اور فرمایا: متکلمین نے مسائل کلامیہ میں جتنے دعوے کیے ہیں ان میں سے بعض پر جزم نہیں کرنا چاہیے۔ مثلا وہ کہتے ہیں کہ رویت بے کیف ہوگی، بے جہت ہوگی۔ صحابہ کا تو مذہب اس میں یہ تھا کہ کیا خبر کیسی ہوگی؟ واللہ اعلم۔ ان تفصیلات کی وجہ سے بعض متقدمین ان متکلمین کے پیچھے نماز پڑھنے کو مکروہ کہتے ہیں جیسے بدعتی کے پیچھے۔ مگر میری سمجھ میں الحمدللہ اسکا فیصلہ آ گیا۔ وہ یہ کہ اگر ان تفصیلات کو باطل فرقوں کے دعووں کے مقابلے میں منع کے درجے میں رکھا جائے، دعوی نہ کیا جائے، گو بصورت دعوی کے ہوں، مگر مقصود دعوی نہ ہو، تو بدعت نہیں۔ اور دعوی واقعی خطرناک ہے۔ میں تو اسی توجیہ کی بنا پر متکلمین کا بے حد معتقد ہوں، انھوں نے حق کی بڑی نصرت کی ہے، اور یہ نصرت بڑی عبادت ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۳/۲۳۴، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۳ھ)

اور فرمایا: فرق باطلہ اور اہل بدعت کی وجہ سے اہل حق کو کلام کرنا پڑا، ورنہ اہل حق فی نفسہ اس قسم کے کلام کرنے کو پسند نہیں کرتے، اس لیے کہ سلف سے منقول نہیں۔ اور میں بھی پسند نہیں کرتا، مجھ کو ہمیشہ اس قسم کے قیل و قال سے نفرت ہے، مگر بیچارے اہل حق کو اہل باطل کی گڑبڑ کی وجہ سے بولنا پڑا اور یہ ان کا بولنا ضرورت کی وجہ سے تھا۔ یعنی اول اہل بدعت نے دین میں شبہات نکالے، اہل حق نے ان کو دلیل کے ساتھ دفع کیا، جس سے صورت مناظرہ کی

پیدا ہوگئی اور علم کلام مدون ہوگیا۔ پس ایسے مسائل میں اہل حق مدعی نہیں، بلکہ اہل بدعت مدعی ہیں۔ اور اہل حق انکے مقابلہ میں مانع ہیں۔ پھر اضطرار کے ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ اس کلام اور مناظرہ کے کچھ حدود اور شرائط بھی تھے، مگر بعض متأخرین نے اس کو بڑھالیا اس حد تک رکھا نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۳۰۹/۴، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ط: ۱۴۲۳ھ)

حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: اس قسم کی آیات (آیات صفات) میں ہمارا مذہب یہ ہے کہ ان پر ایمان لاتے ہیں، اور کیفیت سے بحث نہیں کرتے۔ اور ہم یقیناً جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالی مخلوق کے اوصاف سے منزہ اور نقص وحدوث کی علامات سے مبرا ہے، جیسا کہ ہمارے متقدمین کی رائے ہے۔ اور ہمارے متأخرین اماموں نے ان آیات میں جو صحیح اور لغت وشرع کے اعتبار سے جائز تأویلیں فرمائی ہیں تاکہ کم فہم سمجھ لیں، مثلا یہ کہ ممکن ہے کہ استوا سے مراد غلبہ ہو، اور ہاتھ سے مراد قدرت۔ تو یہ بھی ہمارے نزدیک حق ہے۔ البتہ جہت ومکان کا اللہ تعالی کے لیے ثابت کرنا ہم جائز نہیں سمجھتے۔ اور یوں کہتے ہیں کہ وہ جہت ومکانیت اور جملہ علامات حدوث سے منزہ وعالی ہے۔ (الھند مترجم: ص ۴۸)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: اس تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ دونوں طریق (سلف اور خلف کے آیات صفات میں) علمائے اہل سنت اور اہل حق کے ہیں۔ ان میں سے کسی کی تجہیل یا تضلیل جائز نہیں، گو ترجیح فی نفسہ مسلک سلف کو ہے، اور عارض کے سبب مسلک خلف پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔ (امداد الفتاوی: ۳۴/۶)

اس مقام پر مناسب ہے کہ علم کلام کی تدوین کی ضرورت پر تاریخی پس منظر میں ایک نگاہ ڈالی جائے، تاکہ علم کلام کا صحیح درجہ اور معتدل حیثیت، جو اوپر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات میں مذکور ہے، اسکی مزید وضاحت ہوجائے۔

علم کلام کی تدوین کا تاریخی پس منظر اور ضرورت:

معتصم اور واثق کے انتقال پر (جو مذہب اعتزال اور معتزلہ کے سرپرست تھے) معتزلہ کا زور ٹوٹ گیا۔ واثق کا جانشین خلیفہ متوکل مذہب اعتزال سے بیزار اور معتزلہ کا دشمن تھا۔ اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر معتزلہ کی عظمت واقتدار کے نشانات مٹائے اور ان کو حکومت سے بالکل بے دخل کردیا، لیکن علمی حلقوں میں ابھی معتزلہ کا اثر باقی تھا۔ خلق قرآن کا عقیدہ تو اپنی طاقت کھو چکا تھا، لیکن ان کے دوسرے مباحث اور مسائل ابھی تازہ اور زندہ تھے۔ معتزلہ نے اپنی ذہانت، علمی قابلیت اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کی وجہ سے اپنا علمی وقار قائم کرلیا تھا۔ اور قضا وافتا اور حکومت کے اندر بعض اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ تیسری صدی کے وسط میں ان کا خاصا دور دورہ ہوگیا۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا

جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر، وسیع الفکر اور محقق ہوتے ہیں۔اوران کی آراء وتحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔بہت سے نوجوان طالب علم اور شہرت پسند اعتزال کو فیشن کے طور پر اختیار کرتے۔

امام احمد کے بعد حنابلہ میں کوئی طاقتور علمی اور دینی شخصیت نہیں پیدا ہوئی۔محدثین اوران کے ہم مسلک علماء نے علوم عقلیہ اور نئے طریقہ بحث ونظر کی طرف (جس کا معتزلہ اور فلاسفہ کے اثر سے رواج پڑ چلا تھا)،توجہ نہیں کی۔نتیجہ یہ تھا کہ مباحثہ کی مجلسوں اور درس کے حلقوں میں محدثین کی یہ علمی کمزوری اور فلسفہ کے مبادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی۔اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پلڑا بھاری رہتا۔اور جو لوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سطحی ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے،اور پختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکمات شریعت کو قبول کرتی ہے،وہ معتزلہ کی حسن تقریر،حاضر جوابی اور علمی موشگافی سے متاثر ہوتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری اور اسکی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہورہی تھی۔خود محدثین اوران کے تلامذہ کے گروہ کے بہت سے لوگ احساس کہتری کا شکار تھے،اور معتزلہ کی عقلیت اور تفلسف سے مرعوب ہورہے تھے۔یہ صورت حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لیے سخت خطرناک تھی۔قرآن مجید کی تفسیر اور عقائد اسلام ان فلسفی نما مناظرین کے لیے بازیچہ اطفال بنے جارہے تھے۔مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہورہی تھی۔یہ محض ایک ذہنی ورزش تھی۔اور اصطلاحات کی معرکہ آرائی۔اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے نہ تو محدثین وحنابلہ کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا۔نہ عابدوں وزاہدوں کا زہد وعبادت،اور نہ فقہاء کے فتاوی اور جزئیات ومسائل پر ان کا عبور واستحضار۔

اس کے لیے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں۔جو عقلیت کے کوچے سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رہ نوردرہ چکا ہو۔جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت اور فلسفہ کے علمبردار مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں۔اور ایسے پست وحقیر نظر آتے ہوں جیسے کسی دیو قامت انسان کے سامنے پستہ قد انسان اور نوعمر بچے۔اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امام اہل سنت کی ضرورت تھی۔اور شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔(تاریخ دعوت وعزیمت:۱/۱۰۳،۱۰۴،مجلس نشریات اسلام،کراچی،سنہ ندارد)

امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل اور متوسط مسلک اختیار کیا۔وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الہیات کے بارے میں اور مابعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف عمل کرسکے اور اس کے جزئیات وتفصیلات اور ذات وصفات باری تعالی کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر

کر سکے اور اس کو معیار قرار دیا جا سکے۔ نہ وہ بعض پر جوش محدثین وغالی حنابلہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلامیہ کی حفاظت کیلیے عقل کا انکار اور اسکی تحقیر ضروری سمجھتے تھے۔ اور ان کلامی واعتقادی مباحث جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہو گئے تھے احتیاط وسکوت واجب سمجھتے تھے۔ وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے، جس سے مذہب وعقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا۔ (مصدر سابق:۱/۱۰۸)

ان (امام ابوالحسن اشعری) کا اصلی کارنامہ اس مسلک سنت اور عقیدہ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی تائید نہیں۔ یہ تو محدثین اور عام حنابلہ کر ہی رہے تھے۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب وسنت کے ان حقائق اور اہل سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا۔ اور معتزلہ اور دوسرے فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے عقائد اہل سنت کی صداقت اور ان کا منقول ومعقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔ دین کی (اس) اہم خدمت کی تکمیل اور وقت کے اس عظیم الشان فریضہ کے ادا کرنے میں وہ معتزلہ اور منحرف فرقوں کے معتوب بنے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن وہ ان متشدد محدثین اور جامد حنابلہ کے اعتراضات کا ہدف بھی بن گئے جن کے نزدیک ان مباحث میں حصہ لینا اور فلسفہ کی اصطلاحات کا استعمال کرنا اور نقلی مباحث ومسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک زیغ وضلال کی بات تھی۔ (مصدر سابق:۱/۱۱۰،۱۱۱)

ان (امام ابوالحسن اشعری) کے نزدیک عقائد کا ماخذ یقیناً وحی ونبوت محمدی ہے اور اس کا ذریعہ علم کتاب وسنت اور صحابہ کرام کے اقوال وروایات ہیں۔ اس بارے میں ان کا راستہ معتزلہ وفلاسفہ سے بالکل جدا اور اس کے متوازی ہے، لیکن وہ ان حقائق وعقائد کے ثبوت میں تائید کے لیے عقلی استدلال اور رائج الوقت الفاظ واصطلاحات سے کام لینا نہ صرف جائز بلکہ وقت کے تقاضے کی بناء پر ضروری اور افضل الجہاد سمجھتے ہیں۔ نیز وہ مباحث جن کا تعلق عقلیات وحسیات سے ہے اور معتزلہ وفلاسفہ نے ان کو (خواہ مخواہ) عقائد کی بحث کا جز وبنا دیا ہے اور اپنی ذہانت اور زبان آوری سے ان کو حق وباطل کا معیار قرار دے دیا ہے امام ابوالحسن اشعری کے نزدیک ان سے گریز کرنا درست نہیں۔ شریعت کے وکیل اور ترجمان کو ان دائروں میں بھی ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ (مصدر سابق:۱/۱۱۱)

محافظین شریعت اور متکلمین اہل سنت کا فرض ہے کہ عقائد والہیات کے دائرہ میں جو نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں یا نئے اعتراضات کئے جا رہے ہیں ان کا جواب دین اور زمانہ کی عقلیت کے مطابق عقائد حقہ کو ثابت ومدلل کریں۔ امام ابوالحسن اشعری نے اسی مدعا کو ثابت کرنے کے لیے ایک مستقل رسالہ استحسان الخوض فی علم الکلام تصنیف کیا۔ (مصدر سابق:۱/۱۱۲)

معتزلہ سے ہر وقت برسر مقابلہ ہونے کی وجہ سے امام ابوالحسن (اشعری) کے علم کلام میں بعض انتہا پسندانہ باتیں آ گئی تھیں۔اور بعد کے اشاعرہ نے معاملہ کو اور آگے بڑھا دیا۔امام ابومنصور (ماتریدی) نے حشو وزوائد اور ایسے التزامات کو جو معتزلہ کی ضد میں اشعری علم کلام کا جز بن گئے تھے،اور ان کا ثابت کرنا اور نباہنا مشکل تھا خارج کر دیا اور اہل سنت کے علم کلام کی مزید تنقیح وتہذیب کی اور اس کو زیادہ معتدل اور جامع بنا دیا۔امام ابومنصور اور ان کے متبعین کا یہ اختلاف جزئی اور محدود تھا۔ایسے مسائل جن میں ماتریدیین نے اشاعرہ سے اختلاف کیا ہے تیس چالیس سے زیادہ نہیں،اور ان میں بھی اختلاف بیشتر لفظی ہے۔(مصدر سابق:۱/۱۱۵)

چھٹی ساتویں صدی میں اشعریت وحنبلیت کے اختلاف نے باوجود بنیادی اتحاد کے تقریباً وہ شکل اختیار کر لی تھی جو چوتھی صدی میں اعتزال وسنیت کے اختلاف کی تھی۔اشاعرہ صفات کی تشریح اور تاویل کرتے تھے۔اور حنابلہ اس کو بالکل اپنی حقیقت اور لفظ پر رکھتے تھے۔ہر گروہ خوش نیتی کے ساتھ اس کو دینی خدمت اور سنت وشریعت کے ساتھ خیر خواہی سمجھتا تھا۔لیکن بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول دے دیا گیا۔اور رائی کا پہاڑ بن گیا۔تحزب وتعصب نے اس کو بھی کفر وایمان کا معیار قرار دے دیا۔(مصدر سابق:۲/۲۸۹،حاشیہ۱)

اسلامی عقائد کے دفاع میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کی امتیازی شان:

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:نصوص صریحہ سے ثابت شدہ عقائد تقریباً سب کے یہاں متفق علیہ ہیں۔اس لیے ان میں علاوہ نص کتاب وسنت کے اجماع بھی شامل ہے،لیکن استنباطی یا فروعی عقائد یا قطعی عقیدوں کی کیفیات وتشریحات میں ارباب فن کے اختلافات بھی ہیں۔اس لیے ان میں یکسوئی حاصل کرنے کے لیے متکلمین کے بابصیرت ائمہ میں سے کسی کا دامن سنبھالنا اسی طرح ضروری تھا جس طرح فقہیات اور اجتہادی اختلافات میں ایک فقہ معین کی پابندی ضروری تھی۔اس سلسلہ میں اول تو علمائے کلام کے بارہ میں علمائے دیوبند کا عمومی ذوق ومشرب یہ ہے کہ وہ متکلمین کے اختلافات میں پڑ کر کسی طبقہ کی جنبہ داری نہیں کرتے،بلکہ تمام متکلمین کی عظمت قائم رکھ کر حتی الامکان انھیں جوڑنے ہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ثانیاً اس بارہ میں بھی فقہ معین کی طرح کلام معین سے وابستہ رہتے ہوئے بھی تحقیق کا سرا انھوں نے ہاتھ سے نہیں دیا۔کلامی مسائل میں خصوصیت کیساتھ علمائے دیوبند میں قاسمیت کا رنگ غالب ہے،جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند کی حکیمانہ تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ان مسائل کے اثبات میں حضرت کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اشاعرہ اور ماتریدیہ کے اختلافات میں رد وقدح کی راہ اختیار نہیں فرمائی،بلکہ اہم اور بنیادی مسائل میں رفع

اختلاف اور تطبیق وتوفیق کا راستہ اختیار فرمایا، جس سے کلامی مسائل کا بڑے سے بڑا اختلاف نزاع لفظی محسوس ہونے لگتا ہے۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص ۱۵۱، ۱۵۲)

قاسم ثانی مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت نانوتوی قدس سرہ کے بارے میں لکھتے ہیں: اور یہی وہ فاضل ہے جس نے علم کلام کی ایک ایسے انوکھے طرز میں بناڈالی جو ان شاء اللہ قیامت تک کے واسطے پتھر کی لکیر ہے۔ اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ اس فاضل نے جس کو عام طور پر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اپنی مختلف کتابوں میں جو مفید بیانات درج کیے ہیں وہ اس مسئلہ عقل ونقل میں ہماری بہت زیادہ مشکل کشائی کرتے ہیں۔ (کمالات عثمانی: ص ۳۹۶، مولانا محمد انوار الحسن انور قاسمی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۷ھ)

علمائے دیوبند اشعری ہیں یا ماتریدی؟

اس مرحلہ پر پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کلامی مسائل میں جبکہ مسلمہ امام دو ہی ہیں، ایک امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک امام ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ تعالیٰ تو علمائے دیوبند اشعری ہیں یا ماتریدی؟ اس بارہ میں خود علمائے دیوبند ہی کے عرف میں تو وہ ماتریدی ہی کی نسبت سے معروف ہیں، لیکن انھی میں سے ایک جماعت ان کے اشعری ہونے کی رائے بھی رکھتی ہے۔ اولا اس لیے کہ انکے علمی مورث اعلی حضرت الامام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، انکے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ اشعری ہیں، اس لیے علمائے دیوبند کو بھی وہ اشعری سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ اکابر دیوبند اپنے درسوں، تقریروں اور قلمی تحریروں میں مسائل اشعریت کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں۔ لیکن لقب کے لحاظ سے ان دونوں قولوں کو سامنے رکھ کر جو وجوہ قبول سے خالی نہیں ہیں، انکے ماتریدیت اور اشعریت کے ملے جلے رخ کو سامنے رکھ کر، اگر انھیں اشعریت پسند ماتریدی کہا جائے تو ان کے کلامی مزاج کے حسب حال ہوگا، جبکہ وہ جامع بین الاشعریت والماتریدیت ہی نظر آتے ہیں۔ بلکہ ان کے جامعیت آفریں مباحث کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اشعریت اور ماتریدیت کے اختلافات آخر کار نزاع لفظی ثابت ہوتے ہیں۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص ۱۵۶، ۱۵۷)

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیسری بات جو بہت تجربہ کی ہے، وہ یہ کہ میں نے بھی کتابیں پڑھی ہیں، اسلام کے مذاہب اربعہ اور ان سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے، شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہوگا، ان تمام کے مطالعے کے نچوڑ میں ایک گُر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہلِ سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹیے گا۔ اس کو لکھ لیجیے، چاہے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے، کیسی ہی قوی دلیل پائیں جمہور کے مسلک سے نہ ہٹیے، اللہ تعالیٰ کی جو تائید اس کے ساتھ رہی ہے جس کے شواہد وقرائن ساری

تاریخ میں موجود ہیں۔(خطبات علی میاں:۱/ ۳۴۸،ت:مولانا محمد رمضان میاں،دارالاشاعت کراچی،ط:۲۰۰۲م)

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: میں جرات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی دنیا میں امام ابوالحسن اشعری اور ابوالمنصور ماتریدی کے ایسے وکیل موجود ہیں جو اسلامی معتقدات کے متعلق ان تمام شبہات کا استیصال کرتے ہوئے جو کسی نئے نئے پیرایہ میں ظاہر کئے جائیں قدیم علم کلام کے کامل اور مکمل ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ یہ عبارت علامہ عثمانی کی اس کلامی طاقت کا بے پناہ ظہور ہے۔ جوان کے اندر قدرت نے ودیعت کر رکھی تھی ۔اس عبارت میں غائبانہ انداز میں اپنے آپ کو امام ابوالحسن اشعری کا وکیل ہونے کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں اور لاریب یہ بات ان کی زبان پر پھبتی ہے۔

اور فرماتے ہیں: علم کلام جس غرض کی تکمیل کے لیے مدون کیا گیا میرے نزدیک اس نے اس میں پوری کامیابی حاصل کی۔اور اب میرا قصد ہے کہ میں اسلامی عقائد کے ہر باب کے متعلق بصورت رسائل عدیدہ یہ دکھلاوں کہ علمائے اسلام نے اس تحقیق کو کس حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے۔اور اب ہم کو اس میں کہاں تک ترمیم یا اصلاح کی ضرورت ہے۔(کمالات عثمانی:ص۴۰۰،۴۰۱)

۳: حدیث وفقہ میں متوازن طریقہ

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: غرض علمائے دیوبند کے مسلک میں محض قوت سند یا اصح مافی الباب ہونا اصل نہیں، بلکہ بصورت جمع مناطِ حکم اور بصورت ترجیح تفقہ اصل ہے، کیونکہ صحت سند سے زیادہ سے زیادہ حدیث کے ثبوت کی پختگی معلوم ہوسکتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو حدیث زیادہ ثابت ہو وہ اس دائرہ کا بنیادی فقہ بھی اپنے اندر رکھتی ہو۔ پس اگر اصح مافی الباب حدیث لے لی جائے جس میں صرف حکم مسئلہ موجود ہے، اور غیر اصح مگر قابل احتجاج بوجہ غیر اصح ہونے کے ترک کردی جائے جس میں حکم مسئلہ کے ساتھ علت حکم اور مناطِ حکم بھی موجود ہے، تو حکم بلا علت کے رہ جائے گا، اور جبکہ علت حکم ہی سے یہ حکم اپنی دوسری امثال میں بھی پہنچ سکتا تھا جو اس حکم کے پھیلاؤ اور وسعت کی صورت تھی، اور یہ علت محض اس لیے متروک ہوگئی کہ اس کا مأخذ اصح مافی الباب نہ تھا، بلکہ اپنی روایات سے نسبتہ ضعیف السند تھا، تو یقیناً اس حکم کی جامعیت اور مخزن امثال ہونا ختم ہوجائے گا، جس سے فقہ کی وسعت بھی ختم ہوجائے گی اور متبعین کی وسعت فہم بھی باقی نہ رہے گی، اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ قوتِ سند کے ساتھ اس سے زیادہ مناطِ حکم کی تخریج وتحقیق اور تنقیح وتفقہ روات پر زور دیتے ہیں، جس سے حکم کی قوت بھی نمایاں ہوتی ہے اور وسعت بھی..... پھر صحیح روایتیں تو بجائے خود ہیں، ضعیف روایتیں بھی جو قابل احتجاج ہوں

ہاتھ سے جانے نہیں پائیں گی۔اس لیے تطبیق روایات اور جمع بین الروایات حنفیہ کا خاص اصول ہے جس پر وہ زیادہ زور دیتے ہیں، تاکہ کوئی روایت حدیث چھوٹنے نہ پائے، مگر پھر بھی تعصّبا انھیں قیاس کہہ کر تارکِ حدیث کا خلاف واقعہ لقب دیا جاتا ہے۔حالانکہ حنفیہ اپنے جامع اصول کے لحاظ سے خود ہی صاحب فقہ نہیں، بلکہ وہ اصولا تمام فقہوں کے جامع اور محافظ بھی ہیں، اور اسی لیے شاید حضرت الامام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ **الناس فی الفقه عیال علی ابی حنیفة**۔البتہ اس جمع بین الروایات اور تحقیق وتنقیح مناط کی وجہ سے حنفیہ کے یہاں بلاشبہ توجیہات کی کثرت ہے کہ اس کے بغیر روایات باہم جڑ کر حکم کا جامع نقشہ نہیں پیش کرسکتیں، مگر یہ توجیہات تاویلات محضہ یا تخمینی باتیں نہیں، بلکہ اصول اور نصوص سے مؤید ہونے کی وجہ سے تقریبا حدیث کی تفسیرات کے ہم پلہ ہوتی ہیں۔اس لیے حدیث کے بارہ میں علمائے دیوبند کے مسلک کا عنصر وہی جامعیت واعتدال ہے، جس میں نہ تشدد ہے نہ تساہل، بلکہ وہ روایات کے ساتھ تمام ائمہ کے اصول ساتھ لیکر چلتا ہے۔(علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج:ص۱۴۹تا۱۵۱)

شیخ رشید رضا مصری ۲۷ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ/ ۱۵ اپریل ۱۹۱۲ء کو دارالعلوم دیوبند تشریف لائے۔اس موقع پر حضرت انور شاہ قدس سرہ نے عربی میں برجستہ ایک گھنٹہ خطاب فرمایا۔علمائے دیوبند کے حدیثی وفقہی منہج کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا:

غاية المدرسة (الديوبندية) درس الحديثِ وفقة الحديث .وكان يرى (الشيخ محمد قاسم النانوتوى رحمه الله تعالى) أن المبادى ضرورية، والضرورى يقدر بقدرالضرورة .وطريقة مشائخنا فِي الحديث وفقه الحديثِ طريقة معتدلة مثلى يتوسطون بين الأطراف .أريد بذلك أن للائمة الأربعة أُصولا أربعة أكثرية .وذالك إن الامام مالك يتأسى بعمل أهل المدينة، بل قد يرجحه على الحديث المرفوع، والشافعي يأخذ بأصح مافى الباب، وأحمد يأخذ بالأصح و الصحيح والحسن والضعيف إذا كان ضعفه يسيرا .ويجوز هذا وذلك . وعلى هذا وضع مسنده .وأبو حنيفه يأخذ بهذه الأقسام، وينزل الأحاديث على محامل . فلذا كثرت التأويلات عند الحنيفه، وكثرت الجروح على الراوة عند الشافعية....فمشائخنا يتوسطون فى مثل هذا، لا يأخذون بالتشدد ولابالتساهل، ويوجهون الأحاديث المتعارضة بتوجيهات يكاد يقبلها من يسمعها .مثاله حديث القلتين ....ومثاله أيضا أحاديث القرائة خلف الإمام ....وقالوا فى مسئلة رفع اليدين وجهر آمين ....(ماہنامہ الرشید:دارالعلوم

دیوبند نمبر: ص ۲۴۳ تا ۲۴۷، ج ۴، ش ۲، ۳، صفر و ربیع الاول ۱۳۹۶ھ/فروری، مارچ ۱۹۷۶ء، جامعہ رشیدیہ، ساہیوال)

مدرسہ دیوبند کا مقصد حدیث اور فقہ الحدیث کا درس ہے۔ شیخ محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالی کی رائے یہ تھی کہ مبادی مقصود لغیر ہا ہیں۔ اور ایسی چیز بقدر ضرورت ہی رکھی جاتی ہے۔ اور حدیث اور فقہ الحدیث میں ہمارے مشائخ کا طریقہ، معتدل مثالی اور انتہاؤں کے درمیان ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے چار اکثری اصول ہیں۔ تفصیل یہ ہے کہ امام مالک اہل مدینہ کے عمل کی پیروی فرماتے ہیں، بلکہ اسے حدیث مرفوع پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور امام شافعی اصح مافی الباب کو لیتے ہیں۔ اور امام احمد صحیح، حسن اور ضعیف جس کا ضعف ہلکا ہو، ان سب کو لیتے ہیں۔ اور ہر ایک پر عمل درست قرار دیتے ہیں۔ اور اسی اصول پر انھوں نے اپنی مسند ترتیب دی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ ان سب قسموں کو لیتے ہیں اور احادیث سے مناسب معانی مراد لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے ہاں تاویلات کی کثرت ہے۔ اور شافعیہ کے ہاں راویوں پر جرحوں کی کثرت ہے.....تو ہمارے مشائخ ان امور میں درمیانہ راستہ اختیار کرتے ہیں، نہ تشدد اپناتے ہیں اور نہ ہی تساہل کا شکار ہوتے ہیں۔ اور احادیث متعارضہ کی ایسی توجیہات پیش کرتے ہیں کہ جنھیں سننے والا قبول کرنے لگتا ہے۔ اس کی مثال حدیث قلتین ہے.....اور اسکی مثال قراءت خلف الامام کی احادیث بھی ہیں، اور ہمارے مشائخ رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسئلے میں فرماتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

کسی بھی شخص یا جماعت کی حمایت ومخالفت کی حدود

آج کل یہ عمومی رواج بن گیا ہے کہ خوش گپیوں کے دوران یا فارغ وقت گذارنے کے لئے یا جہاں چار آدمی جمع ہوتے ہیں، دانستہ یا نادانستہ، غیبت، بہتان تراشی یا بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنی دنیا اور آخرت کا بڑا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم اپنے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح "میرے والد میرے شیخ" میں لکھتے ہیں:.....کسی شخص یا جماعت کی حمایت ومخالفت میں جب نفسانیت شامل ہو جاتی ہے تو نہ حمایت اپنی حدود پر قائم رہتی ہے نہ مخالفت، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جس شخص کی حمایت کرنی ہوا سے سراپا بے داغ اور جس کی مخالفت کرنی ہوا سے سراپا سیاہ ثابت کرنے سے کم پر بات نہیں ہوتی۔ آج کل حمایت ومخالفت میں اس قسم کے مظاہرے عام ہو چکے ہیں، بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جس زمانے میں منظور نظر ہوا تو اس کی ساری غلطیوں پر پردہ ڈال کر اسے تعریف وتوصیف کے بانس پر چڑھا دیا گیا، اور جب وہی شخص کسی وجہ سے زیر عتاب آ گیا تو اس کی ساری خوبیاں ملیامیٹ ہو گئیں اور اس میں نا قابل اصلاح کیڑے پڑ گئے۔ بعض اوقات جب عام فضا کسی شخص یا جماعت کے خلاف ہو جاتی ہے تو اس کے بارے میں الزام تراشی اور افواہ طرازی کو عموماً عیب نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے عیوب کی خبریں لانے میں لطف محسوس کیا جاتا ہے اور اس میں تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ حضرت والد صاحب ایسے مواقع پر اپنے متعلقین کو اس طرز عمل سے سختی کے ساتھ روکتے اور فرماتے کہ اگر ایک شخص کسی جہت سے برا ہے تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ اس کی تمام جہات لازماً ہی بری ہوں گی اور اب اس کی بے ضرورت غیبت اور اس کے خلاف بہتان تراشی جائز ہو گئی ہے۔ (میرے والد میرے شیخ: 147-149)

ایک استاذ.....ایک شاگرد

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ کی روشنی میں حصول علم سے متعلق فوائد

مولانا فخر الاسلام مدنی، استاذِ جامعہ

سورہ کہف میں مذکور حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کی واقعہ کی روشنی میں تعلیم وتعلم سے متعلق منتخب علمی فوائد کو یکجا کر کے پیش کیا جارہا ہے۔ واضح رہے کہ ان فوائد کا تعلق فقط قرآن مجید کی آیات میں موجود قصے سے ہے۔

اَمابعد: فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ: ''وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا.....''إلٰی قولہٖ تعالیٰ: ''ذٰلِکَ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا'' (الکہف:۶۰-۸۲)

ان آیاتِ کریمہ میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے درمیان پیش آئے ایک واقعہ کا تذکرہ ہے، جو یقیناً ایسے مضمر اسرار کو متضمن ہے جس سے خالقِ کائنات نے اپنی کتاب لم یزل میں پردہ اُٹھایا ہے۔

ایک طرف اولوالعزم پیغمبر ہیں تو دوسری طرف ولیِ کامل۔ زادِراہ ایک مچھلی ہے، اور گزارے لائق معمولی خوراک، نیز اس واقعہ میں ایک نوجوان کا ذکر ہے جو بحر وبر میں حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کے رفیقِ سفر رہے، پھر موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی صاحب اسرار پیغمبر خضر علیہ الصلاۃ والسلام سے ملاقات کا تذکرہ ہے، جہاں زہد وجمال اور علم وکمال اپنی مثال آپ ہے۔

ایک دفعہ اپنے ایک استاذ اور معتمد عالم دین سے یہ سننے کا اتفاق ہوا کہ وہ مدارس کے نظام سے متعلق یہ استدلال پیش فرمارہے تھے، مثلاً امتحان کا ثبوت ''وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ط'' اور انعامات تقسیم کرنے کے لیے فرمایا: ''قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' اور حاضری کے لیے ''وَتَفَقَّدَ الطَّیْرَ فَقَالَ مَا لِیَ لَآ اَرَی الْهُدْهُدَ'' اور غیر حاضری پر سزا کے لیے ''لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا'' وغیرہ۔

میں نے سوچا جب ان آیاتِ کریمہ میں سیاق وسباق کا تعلق علم سے نہیں ہے، پھر بھی مانوسیت کی حد تک اتنے استدلال کی گنجائش ہے تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سفر خالص حصولِ علم کی خاطر ہے، وہاں بطریق اَولیٰ فوائد کا استنباط کیا جاسکتا ہے، کیونکہ سیاق وسباق اس کی تائید کرتا ہے۔ اسی علمی گفت وشنید کو مدِنظر رکھتے ہوئے چند علمی نکات کے استنباط کا شرف حاصل ہوا، جو ہدیہ قارئین ہیں:

۱:.....علمی گفت وشنید کی محافل ومجالس خیر کثیر کا سبب ہوتی ہیں، جس طرح اس واقعہ میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت

موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام سے سوال کیا تھا، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے علمی خزانہ سے پردہ اٹھایا۔

۲:.....علم ایسی شئے ہے جو خود چل کر کسی کے پاس نہیں آتی، بلکہ اس کے پاس جایا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کے طرزِ عمل سے عیاں ہوتا ہے، اور اسی کو علمی رحلت کہتے ہیں، اور یہ اسلاف کی سنت ہیں۔

۳:..... ہر عالم سے بڑھ کر کوئی عالم ہوتا ہے، لہٰذا اپنے علم پر غرور نہیں کرنا چاہیے: ''وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ۔(۷۶)''

۴:.....روایۃ الاکابر عن الاصاغر: بڑوں کا چھوٹوں سے استفادہ میں عار محسوس نہ کرنا، اگر ہم حضرت خضر علیہ السلام کو ولی فرض کریں، جیسا کہ اکثر مفسرین کی رائے ہے۔

۵:.....علم کی فضیلت کہ نبی کو بھی اس کے حصول کی خاطر سفر کا حکم دیا گیا۔

۶:.....حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی فضیلت کہ انہوں نے طلب علم کی خاطر سفری صعوبتوں کو جھیلا: ''منهومان لایشبعان: منهوم فی العلم، ومنهوم فی الدنیا لایشبع منها۔''

۷:.....دودھ اور علم ایسی چیزیں ہیں، جن میں زیادتی کا سوال مستحسن ہے: ''رب زدنی علما، اللّٰهم بارک لی فیه وزدنی منه۔''

دونوں چیزوں میں ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ خواب میں دودھ کو علم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸:.....کوئی زمانہ تعلیم وتعلم، اقامت وسفر ظلم وعدل کسب وتجارت اور فقر وفاقہ سے خالی نہیں ہوتا، نیز تعلیم وتعلم کا سلسلہ نیا نہیں، بلکہ قدیم دور سے چلا آرہا ہے۔

۹:.....طلبِ علم کسی عمر کے ساتھ مختص نہیں، اور بڑھاپے میں طلب علم کی جستجو قابل ملامت نہیں۔

۱۰:.....استاذ وشیخ کی ملازمت ومصاحبت شرائطِ تعلم میں سے ہے، جس کی نظیر آج کے زمانہ میں عنقاء ہے۔

۱۱:.....شاگرد کا استاذ سے مکمل استفادہ کرنا ضروری نہیں، بلکہ بعض علوم سے مستفید ہونا بھی کافی ہے: ''هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا(۶۶)'' (اگر یہاں ''مِنْ'' تبعیض کے لیے ہو)۔

۱۲:.....استاذ کا طلبہ علم کے سامنے محتاجی کی بجائے استغنا برتنا، جیسا کہ حضرت نے استغنا کا اظہار کیا: ''قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا(الکہف:۶۷)'' البتہ طالب علم کو استغنا کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

۱۳:.....علم دو قسم پر ہے: ۱: ظاہر (علم الشرائع) ۲: باطن (علم الاسرار)

۱۴:.....علم کی ماخذ کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں: ۱: علم کسبی، ۲: علم لدنی (جس کو عرف میں علم وہبی سے تعبیر کیا جاتا ہے): ''وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکہف ۶۵)''

۱۵:.....علم اللہ کی طرف سے ایک رحمت ہے:''و اٰتیناہ رحمۃ من عندنا''

۱۶:.....ضروری نہیں کہ آدمی تمام علوم اور فنون کا ماہر ہوں، البتہ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۱۷:.....کسی بھی علم کو شروع کرنے سے قبل اس کی حقیقت ومبادیات سے آشنائی ضروری ہے:''وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا(الکہف:۶۸)''

۱۸:.....علم حاصل کرنے کے لیے صبر کی ضرورت:''اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا(الکہف۶۷)''

۱۹:.....صبر کے لیے علم کی ضرورت:''وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا(الکہف:۶۸)''

۲۰:.....علم کا مشقت کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے، جو صبر نہیں کرسکتا علم کا کچھ حصہ بھی حاصل نہیں کرسکتا:''اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا(الکہف:۶۷)''، اسی لیے آیت کے سیاق وسباق میں سات مرتبہ صبر کا لفظ آیا ہے۔

۲۱:.....طالب علم کا استاذ کی ڈانٹ ڈپٹ وناراضگی پر صبر کرنا:''اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا (الکہف۶۷)'' بھلا کون اس جملہ کو مکرر بطور ڈانٹ سننے کی ہمت رکھتا ہے؟

۲۲:.....علم رشد وہدایت ہے:''هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا(الکہف۶۶)''

۲۳:.....تعلیم وتعلم کا سلسلہ کسی عمارت و بنا کا محتاج نہیں، بلکہ یہ سلسلہ چلتے پھرتے بھی سر کیا جا سکتا ہے:''فَانْطَلَقَا.....الخ''

۲۴:.....استاذ کی جانب سے ہر غلطی پر تحذیر وتنبیہ کا ہونا مفید ہے:''اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا(الکہف:۷۵)''

۲۵:.....دو مرتبہ طالب علم کی غلطی قابل برداشت، اور تیسری دفعہ نا قابل برداشت ہے:''قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ''

۲۶:.....طالب علم کا داخلہ کے لیے درخواست دینا، خواہ زبانی ہو یا تحریری:''قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا(الکہف:۶۶)''

۲۷:.....طالب علم کا مدرسہ وجامعہ کے اصول وضوابط کی پابندی کا عہد کرنا اور ان کی پاسداری کرنا:''وَلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا(الکہف:۶۹)''

۲۸:.....طالب علم کا خلافِ ظاہر امور پر سکوت اختیار کرنا اور اسے اربابِ انتظام واہتمام کے سپرد کرنا:''فَلَا تَسْئَلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا(الکہف:۷۰)''

۲۹:.....جب طالب علم کا مدرسہ سے اخراج کیا جائے تو اسے اس کی غلطی پر تنبیہ کرنا اور غلطی کی نشان دہی کرنا جو اس

کے اخراج کا سبب بنی: ''سَاُنَبِّئُکَ بِتَاْوِیْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا (۷۸)''

۳۰:.....علم عمل کا تقاضا کرتا ہے، جیسا کہ حضرت خضر علیہ الصلاۃ والسلام کے فعل سے معلوم ہوتا ہے۔

۳۱:.....علم اور اہل علم کو اللہ رب العزت کی عنایت خاصہ اور رہنمائی کا حاصل ہونا، اسی راہنمائی میں حضرت خضر نے سارے امور سرانجام دیئے: ''فَاَرَادَ رَبُّکَ اَنْ یَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا''

۳۲:.....درس کی تفصیلی وضاحت اور درس کو امثلہ کے ذریعے آسان اور سہل انداز سے پیش کرنا، مثلاً: ''اَمَّا السَّفِیْنَةُ .....وَاَمَّا الْغُلٰمُ..... وَاَمَّا الْجِدَارُ''

۳۳:.....سبق کے دوران استاذ کی طرف سے اختصار کے ساتھ تنبیہ اور طالب علم کا مختصر انداز میں عذر پیش کرنا، اور پھر سبق کا بدستور جاری رہنا: ''قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکَ..... قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ..... فَانْطَلَقَا''

۳۴:.....معلوم ہوگیا کہ درس کا تعلق قول اور عمل دونوں سے ہے اور اس میں سبق کے ایک یا دو مرتبہ اعادے کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے، قول اور عمل دونوں تکرار کو لازم ہیں۔

۳۵:.....سبق پڑھانے سے پہلے اس کی تیاری کرنا، اور اس کے لیے خطہ اور ضابطہ تعلیم متعین کرنا: ''فَلَا تَسْئَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰٓی اُحْدِثَ لَکَ مِنْهُ ذِکْرًا (الکہف:۷۰)''

۳۶:.....طالب علم کو تنبیہ کرتے ہوئے اس کو درس کی طرف متوجہ کرنا: ''سَاُنَبِّئُکَ بِتَاْوِیْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا (الکہف:۷۸)'' پھر اس بات کی وضاحت کرنا جس کا ماقبل میں وعدہ کیا تھا: ''اَمَّا السَّفِیْنَةُ... وَاَمَّا الْغُلٰمُ... وَاَمَّا الْجِدَارُ'' تاکہ طالب علم بات کو اچھی طرح سمجھ سکے۔ اور اخیر میں دوبارہ تنبیہ کرنا: ''ذٰلِکَ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا (الکہف:۸)'' اور اس سب میں طلبہ کے مزاج وطبائع کی رعایت اور فہم وذکا میں تفاوت کی رعایت کی گئی ہے۔

۳۷:.....استاذ کا صاحبِ کشف والہام ہونا، اور خداوندِ قدوس کی جانب سے نصرتِ خاصہ کا حاصل ہونا: ''وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ''

۳۸:.....ایک عالم کا نت نئے رونما ہونے والے فتن کو بھانپنا، اور وقت سے پہلے ان کو روکنے کی منصوبہ بندی کرنا۔

۳۹:.....اور اپنی ذمہ داریوں کو بحسن خوبی سرانجام دینا: ''فَخَشِیْنَآ اَنْ یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا وَّکُفْرًا (الکہف:۸۰)''

۴۰:.....لفظ ''صبر'' آیات مذکورہ میں سات دفعہ تکرار کے ساتھ آیا ہے، جو راہِ تعلیم وتعلم کی مشقتوں اور صعوبتوں سے معمور ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

۴۱:.....امورِ مستحسنہ میں خطاب کے دوران استاذ کے مقام ورتبہ کی رعایت رکھنا: ''لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَیْهِ

اَجْرًا (الکہف:۷۷)''

۴۲:.....عالم ربّانی کا اپنے علم ومنصب کے عوض کچھ مال وصول کرنا یا اس کا خواہاں ہونا اس کی شان کے منافی ہے:''فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا.....الخ''اس موقع پر انہوں نے اپنا تعارف نہیں کیا، ورنہ ان کی خدمت کی جاتی۔

۴۳:.....حقیقی علم تو اللہ کے پاس ہے، اور وہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے:''اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکہف:۶۵)''

۴۴:.....علم کا بدون صبر حاصل ہونا از قبیل محال ہے:''سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَاءَ الله صَابِرًا''

۴۵:.....تعدادِ طلبہ کی کمی باعثِ ملامت نہیں، جبکہ وہ اخلاص کی صفت سے آراستہ ہوں، خصوصاً شعبہ تخصصات میں۔

۴۶:.....استاذ ایک نمونہ ہے، طالب علم کو چاہیے کہ اپنے استاذ کے اقوال وافعال کو اپنائے، اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنے استاذ کی ہر ہر ادا پر نظر تھی، نیز استاذ کو محتاط رہنا چاہیے۔

۴۷:.....استاذ کا اپنے طلبہ کو پیش آمدہ حالات وحوادثات کی سختیوں سے آگاہ کرنا، ان کو ذہنی طور پر تیار کرنا:''اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا (الکہف:۶۷)''

۴۸:.....ہر طالب علم مستحقِ تعلیم نہیں ہوتا، بلکہ جو صبر واطاعت کا شیوہ اختیار کرے، معصیت ومخالفت سے اجتناب برتتا ہو، اسی کو استحقاق حاصل ہے:''لَآ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا (الکہف:۶۹)''

۴۹:.....طریقہ تعلیم میں قول سے زیادہ عملی وتطبیقی طریقہ تعلیم موثر ہے، جیسا کہ قصہ میں آپ نے ملاحظہ کیا، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول''صلوا کما رایتمونی اصلی''اور''خذوا عنّی مناسککم''اسی پر شاہد ہے۔

۵۰:.....طالب علم کما حقہ سبق سمجھنے اور اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بار بار اعتراض اس پر دلالت کرتا ہے۔

۵۱:.....افہام وتفہیم کے لیے سبق کو سوال وجواب کے اسلوب پر پیش کرنا، تاکہ جواب اوقع فی النفس ہوجائے، اگرچہ سوال بزبانِ حال ہو، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذہن میں تین سوال پیدا ہوئے، اور پھر ان سب کا یک مشت جواب دیا گیا۔

۵۲:.....درس سے متعلق سوال وجواب سبق کے اختتام پر ہونا چاہیے:''سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِیْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا (الکہف:۷۸)''جبکہ دورانِ سفر حضرت نے سوالوں کا جواب نہیں دیا، بلکہ تنبیہ کی:''قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا (الکہف:۷۵)''پھر آخر میں اطمینان بخش جواب دیا۔☆☆

درس وتدریس کی اہمیت اور اکابر کا طرز

درس وتدریس کے حوالے سے ایک راہنما خطاب

مولانا مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم

مرتب: مولانا محمد زعفران ہزاروی

(بعد حمد وصلوٰۃ) میرے ذمہ یہ عنوان لگایا گیا تھا کہ میں آپ کو بتاؤں کہ فقہ کے پڑھانے کا کیا طریقہ ہے؟ یہاں تو سب علماء کرام تشریف فرما ہیں، میں کیا طریقہ بتاؤں؟ یہ تو وہی معاملہ ہوا کہ ایک نام نہاد مولوی صاحب کہیں جا کر پھنس گئے۔ محرم الحرام کے ایام تھے وہاں کے حضرات نے ان سے مطالبہ کیا کہ حضرت آپ بڑے عالم ہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے موضوع پر تقریر کریں، ان کو سٹیج پر بٹھا دیا گیا تو انہوں نے کہا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کربلا کے میدان میں شہید کر دیا گیا؟ سب کہنے لگے کہ پتہ ہے۔ فرمانے لگے کہ جاؤ جب پتہ ہے پھر مجھ سے کیا سننا چاہتے ہو؟ انہوں نے مشورہ کیا کہ ہم کوئی حیلہ کرتے ہیں، آئندہ روز پھر ایسا ہی ہوا کہ جب انہوں نے پوچھا کہ تم کو پتہ ہے؟ تو آگے بیٹھنے والے حضرات کہنے لگے جی پتہ ہے، اور جو لوگ کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے وہ کہنے لگے کہ نہیں پتہ، تو وہ مولوی صاحب کہنے لگے کہ جن کو پتہ ہے وہ دوسروں کو بتا دیں جنہیں نہیں پتہ۔

بہر حال چونکہ بڑوں کا حکم ہے اور الأمر فوق الأدب کے تحت اس سے چھٹکارا نہیں۔ ایسے حضرات کی موجودگی میں جو اپنے اساتذہ، اکابر اور شیوخ ہوں، لب کشائی کی جائے بہت مشکل ہے۔ لیکن ہم نے جو کچھ اپنے بڑوں سے سنا یا پڑھا اور ان کی خدمت میں رہ کر جو استفادہ کیا وہ عرض کر دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں اور ہم سب کے لیے نافع بنائیں، آمین۔ اس بارے میں احقر کے خیال میں سب سے بنیادی چیز طلباء کی نفسیات کو سمجھنا ہے۔

کتبِ فقہ کی تدریس کا طریقہ:

تدریس کے متعلق میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ابتداءً طالب علم کو زیادہ تفصیلات میں نہ الجھایا جائے، جیسا کہ نورالأیضاح یا کنز الدقائق ہے۔ طالب علم کو نفسِ کتاب کا مطلب اور معنی بتانا چاہیے۔ دراصل یہ ہمارا بہت بڑا المیہ ہے کہ طلباء کی استعدادیں اتنی کمزور ہوگئی ہیں کہ ان کو عبارت تک پڑھنا نہیں آتی، یہ بہت نقصان دہ بات ہے۔

طلباء عبارت پر محنت کریں:

طلباء کو عبارت بالکل صحیح آنی چاہیے، اساتذہ کرام اس کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔ ہمارے حضرت والد صاحب

رحمۃ اللہ علیہ عبارت پر بہت گرفت فرماتے تھے۔طلباء عبارت پڑھنے میں ہمزہ قطعی اور وصلی کا بالکل خیال نہیں رکھتے،ساری عبارت کو وصل کے ساتھ ہی پڑھتے ہیں۔ترکیب کا تو طلباء کو بالکل پتہ ہی نہیں ہوتا۔

ایک صاحب ''ذھب اللّٰہ '' کی ترکیب کررہے تھے کہ ''ذھب'' مضاف اور لفظِ ''اللہ'' مضاف الیہ۔''ذھب اللہ'' کی یہ ترکیب سن کے میں حیران رہ گیا۔ آپ حیران ہورہے ہوں گے لیکن یہ زیادہ حیرت والی بات نہیں کیونکہ

ع ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

قواعد کے ذریعے عبارت کی تشریح:

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اگر آپ ہر بات اور فصل کے شروع میں طلباء کے ذہن میں کوئی ضابطہ اور قاعدہ ڈال دیں ،جس پر تمام جزئیات منطبق ہوسکیں تو یہ بہتر رہے گا۔اس کے لیے ظاہر ہے کہ استاذ کو محنت کرنی ہوگی لیکن اس کا فائدہ بہت ہوگا۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کا اندازِ تدریس:

حضرت حکیم الاُمتؒ فرماتے تھے کہ میں تدریس میں بہت محنت کیا کرتا تھا۔صدرا جو فلسفہ کی مشہور کتاب ہے،اس کی ایک نہایت مشکل بحث مثناۃ بالتکریر جس کا نام سن کر طلباء گھبرا جاتے تھے۔میں نے اس پر بہت محنت کی پھر سبق پڑھایا اور سبق پڑھانے کے بعد جب میں نے بتایا کہ یہ ہے وہ بحث جو بہت مشکل ہے تو طلباء گھبرانے لگے۔حضرت نے فرمایا اب گھبرانے کی کیا بات ہے؟اب تو تم سمجھ گئے ہو،یہ بحث ختم ہوچکی ہے۔

طلباء سے سبق بھی سنیں:

آپ طلباء سے سبق سنیں،اب سبق سننے کا رواج بہت کم ہوگیا ہے۔ہمارے اساتذہ تو ہر سہ ماہی امتحان کے لیے پوری کتاب سنتے تھے۔فرماتے تھے کہ ترجمہ بھی کرواور اس کا مطلب بھی بتاؤ۔صحیح طریقہ یہی ہے کہ طالب علم بھی خوب محنت کریں اور اساتذہ کرام بھی،اور طلباء کو عبارت کا صحیح اعراب اور ترکیب معلوم ہونی چاہیے۔یہ نہ ہو کہ ذھب مضاف اور لفظِ اللہ مضاف الیہ۔حضرات اساتذہ کرام کو طلباء کے سامنے مختصر مسئلہ کی وضاحت بھی کرنی چاہیے۔بڑی کتابوں مثلاً کنز الدقائق میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تفصیل تو ہوگی لیکن زیادہ تشریح نہ ہو۔

غیر متعلقہ مباحث سے اجتناب:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک صاحب ''میزان الصرف'' پڑھاتے تھے۔میزان الصرف کے شروع میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے الحمدللّٰہ رب العلمین و العاقبۃ للمتقین ۔ایک طالب علم ان کے

پاس میزان الصرف پڑھنے آیا تو انہوں نے یہ بحث شروع کر دی کہ الحمد کے شروع میں الف لام ہے، اس کی چار قسمیں ہیں: عہدِ ذہنی، عہدِ خارجی اور استغراقی وغیرہ۔ اب سامنے بیٹھا ہوا طالب علم استغراق میں مبتلا ہے، اس بیچارے کو ان چیزوں کا کیا پتہ وہ تو اپنی پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ تو کتبِ فقہ کی عبارت طالب علم سے بہترین انداز میں سنی جائے، طالب علم بدمحنت ہو چکے ہیں اور اس دور میں تو وہ محنت کرتے ہی نہیں۔

طلبہ اردو شروحات سے اجتناب کریں:

اردو شروحات نے فقہ اور تعلیم کا ستیاناس کر دیا ہے، طلباء کو سب سے زیادہ نقصان اردو شروحات نے پہنچایا ہے۔ ہمارے زمانہ میں یہ اردو شروحات نہیں تھیں، اور اگر تھیں بھی تو اساتذہ منگواتے نہیں تھے، بلکہ فرماتے تھے کہ اصل کتاب پڑھو۔

حضرت مفتی جمیل احمد تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ سہارنپور میں طلبہ کو "معرّی" کتابیں دی جاتی تھیں، نہ ان پر حاشیہ ہوتا، نہ زبر نہ زیر نہ پیش۔ اب تو سائنس کی ترقی اور علم کے زوال کا دور ہے۔ اب یہ مصیبت آ گئی ہے کہ طالب علم عبارت پر زبر زیر کے ہوتے ہوئے بھی صحیح پڑھ لیں تو یہ ان کی مہربانی ہے، کیونکہ اب استعداد کمزور ہو گئی ہے۔ و الی اللّٰہ المشتکی۔

عالم کو ذی استعداد ہونا چاہیے:

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب ہماری مدینہ منورہ حاضری ہوئی (یہ ستر پچھتر سال قبل کی بات ہے) تو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے بھائی حضرت سید احمد رحمۃ اللہ علیہ جو مدرسہ علومِ شرعیہ کے بانی تھے، انہوں نے ہمارے دادا جان کو کہا، کہ اب آپ کا قیام یہیں ہوگا لہٰذا آپ یہاں مدرسے میں کتابیں پڑھائیں۔ کتابیں تقسیم کر دی گئیں۔ وہاں ہدایہ، موطا امام مالک کے علاوہ کچھ دوسری کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں، جن کا اس دور میں ہندوستان میں رواج نہیں تھا۔ حضرت دادا جان نے عرض کیا کہ حضرت فلاں فلاں کتابیں ہمارے ہاں نہیں پڑھائی جاتیں، لیکن اگر آپ چاہیں میرے نام لکھ دیں، میں ان شاء اللہ پڑھا دوں گا۔ یعنی امانت داری کے ساتھ بتا دیا کہ فلاں فلاں کتاب میں نے نہیں پڑھی۔ ہندوستان میں نہیں پڑھائی جاتیں۔ ظاہر ہے کہ جس نے وہ کتاب پڑھی ہی نہ ہو وہ کیسے وہ کتاب پڑھا سکتا ہے؟

لیکن خیر وہ ذی استعداد لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تفقہ، بصیرت سب دولتیں عطا فرمائیں تھیں۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب نے بہت قیمتی جملہ فرمایا کہ مولوی صاحب! عالم کو ہر کتاب پڑھائی تھوڑا ہی جاتی ہے؟ اب کیا آپ کو

ساری دنیا کی کتابیں پڑھائی جائیں؟ عالم کے لیے پڑھی اور بے پڑھی سب کتابیں برابر ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے کیا مشکل ہے؟ محنت کریں، ان شاء اللہ آ جائیں گی۔ اس دور میں بھی یہ جملہ بالکل صحیح ہے، پڑھی اور بے پڑھی سب کتابیں برابر ہیں۔ آجکل جو کتابیں پڑھی ہوں وہ بھی انہی کی طرح ہیں جو پڑھی ہوئی نہ ہوں، گویا کہ اب معاملہ بالکل برعکس ہو گیا ہے۔

لطیفہ: ہمارے ہاں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ جو کتاب جس استاذ کو دی جاتی ہے، وہ لے لیتا ہے چاہے وہ کتاب اسے آتی ہو یا نہیں گویا جیسے طلباء ویسے اساتذہ۔ مل جل کر دین کی خدمت کریں گے، اجتہاد سے کتاب کو حل کریں گے لیکن یہ اجتہاد ایسا ہی ہوگا جیسے ایک صاحب اور اس کی اہلیہ کہیں جا رہے تھے۔ نہ جانے ان کو کیا مصلحت سوجھی، شاید سوچا کہ گدھے پر زیادہ وزن نہ آئے خود سوار ہو گئے اور عورت کو کہا کہ تم ذرا پیدل چلو۔ اب ایک ایسی بستی میں پہنچے تو لوگوں نے دیکھا تو کہنے لگے: شرم نہیں آتی، صنفِ نازک کو پیدل چلا رہے ہو اور خود اوپر بیٹھ گئے؟ اس نے کہا ٹھیک ہے غلطی ہو گئی۔ آگے سفر اس کے برعکس کرنے لگے، کہ خود پیدل چل رہے ہیں اور عورت سے کہا تم سواری پر آ جاؤ۔ اب دوسری بستی میں پہنچے تو وہ لوگ بھی بڑے برہم ہوئے کہ تم بڑے بے غیرت ہو جو عورت کے غلام ہو، عورت سوار ہے اور تم پیدل ہو۔ خیر اس نے تطبیق کی کوشش کی کہ اب دونوں سوار ہو گئے۔ جب تیسری بستی میں پہنچے تو وہاں والے بھی بہت ناراض ہوئے اور تنبیہِ بلیغ کی کہ تم کو شرم نہیں آتی کہ اس گدھے کو مار رہے ہو دونوں اس پر سوار ہو گئے۔ اب میاں بیوی نے مشورہ سے طے کیا کہ اب دونوں مل کر اس گدھے کو اٹھا لیتے ہیں۔ تو جب اس طرح مل کر کوئی اجتہاد کرے گا تو یہی نتیجہ ہوگا۔

مدرّس کو قابل ہونا چاہیے:

ایک جگہ ایک استاذ گلستان پڑھا رہے تھے، سامنے طلبہ بیٹھے تھے، میں ان کے پاس سے گزرا تو گلستان کی ایک عبارت آئی: ''تو چراغ را نہ بینی بچراغ چہ بینی''

یعنی نابینا کو کہا جا رہا ہے کہ تمہیں چراغ تو نظر نہیں آتا چراغ کے ذریعے سے تم کیا دیکھو گے؟ ترجمہ تو اس کا یہ تھا۔ لیکن وہ اس طرح ترجمہ کرنے پر اصرار کر رہے تھے تو چراغ کو نہیں دیکھتا تو چراغ کو کیا دیکھے گا؟ یہ ترجمہ ہو رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب استاذ کو ہی عبارت و کتاب نہیں آ رہی تو طلباء کا مستقبل کیا ہوگا؟

ابھی ہمارے ایک معزز مہمان انتقال کے بارے میں بحث فرما رہے تھے، علم کا انتقال، فقہ کا انتقال، نور کا انتقال، تو انتقالات جب ہی ہوں گے جب استاذ کے پاس بھی علم ہو۔ یہاں تو کتاب ہی ایسے شخص کو دی جاری ہے جو آنکہ

خویشتن گمراہ است کا مصداق ہے۔

طلباء عبارت خود حل کریں:

احقر کے والد صاحبؒ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ کے والد ماجد حضرت مولانا یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ خود سبق کی تقریر نہیں کرتے تھے بلکہ طلبہ پر بوجھ ڈالتے تھے کہ کتاب کو خود حل کرو، دراصل یہ بڑا مجاہدہ ہے کہ استاذ ہر طالب علم کی بات سنے۔ استاذ کی عادت تو خود سنانے کی ہوتی ہے۔ استاذ طالب علم کو کہے کہ تم عبارت پڑھو ترجمہ کرو، تقریر کرو، ہم پھر بتائیں گے کہ تقریر میں کہاں غلطی ہوئی۔ لیکن اگر کچھ عرصے تک یہ کام ہو جائے تو طالب علم کو کتاب میں بصیرت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے یا کیا سمجھ رہا ہے۔

تذکرہ صاحب کنز اور صاحب عقائد:

کنز کی عبارت مشکل ترین ہے۔ کنز کے معنیٰ ''خزانہ'' ہے جس کو آپ نے نکالنا ہے۔ اس کی عبارت بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت امام عبداللہ نسفیؒ بہت بڑے آدمی اور امام ہیں بلکہ ان کے دور کے تمام حضرات ہی علوم وفنون کے ماہر اور جامع ہوتے تھے، صرف فقہ کے ہی ماہر نہیں تھے۔ ایک دوسرے علامہ عمر نسفی ہیں جو صاحبِ عقائد ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ **ومن العجائب انه دقّ باب الزمحشری**، علامہ زمخشری کے دروازے پر پہنچ گئے، جا کر دستک دی۔ علامہ زمخشری نے پوچھا: **من انت** ؟ جواب دیا کہ عمر، انہوں نے کہا: **انصرف**، یہ کہنے لگے: **عمر لاینصرف**، علامہ زمخشری نے جواب دیا: **اذا نکّر صرف**۔

مہتمم کے لیے مدرس کا درس سماعت کرنا:

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ میں نے ایک دفعہ اپنے والد ماجد کے سامنے کنز پڑھائی۔ والد صاحب فرمانے لگے کہ تم نے بہت زیادہ پیچیدہ تقریر کر دی، طالب علم کو تو سمجھ نہیں آ رہی ہوگی۔ اس وقت پڑھانے کا طریقہ بھی سکھایا جاتا تھا۔ یہ طریقہ بالکل صحیح ہے کہ جس استاذ کو کتاب دی جائے، مہتمم صاحب اس سے خود ایک مرتبہ سماعت فرمالیں۔

صدر مدرّس کون ہو؟:

حضرت مفتی جمیل احمد تھانویؒ بھی فرمایا کرتے تھے کہ سہارنپور میں صدر مدرس حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ تھے۔.....صدر مدرس اس شخص کو بنایا جاتا ہے جو تمام علوم وفنون کا ماہر ہو۔ کسی بھی کتاب پڑھانے والے استاذ کو کوئی اشکال پیش آئے تو صدر مدرس اس کو حل کر دے۔ فرماتے تھے کہ میں جب جامعہ اشرفیہ لاہور آیا، تو میرے پاس

ایک دفعہ میراث کا سوال آیا تو میں وہ سوال لے کر صدر مدرس کے پاس چلا گیا، وہ بزرگ عالم تھے تو کہنے لگے، میں نے تو میراث نہیں پڑھی، اس پر تعجب ہوا کہ صدر مدرس کے لیے یہاں یہ شرط نہیں۔ حالانکہ صدر مدرس کے لیے تو یہ ضابطہ ہوتا ہے کہ اس کو ساری کتابوں اور علوم وفنون پر مہارت ہو۔

یہ بات آپ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ جس مدرس کو آپ مقرر فرماتے ہیں کم از کم اس سے صدر مدرس ایک مرتبہ کتاب کو سنیں تا کہ اچھی طرح تسلی ہو جائے کہ یہ مدرس اس کتاب کو پڑھا سکتا ہے۔ یہ بڑا اہم کام ہے، اس سے آئندہ آنے والی نسلوں کا فائدہ ہو سکے گا۔

مدرّس کو حریص ہونا چاہیے:

دوسری بات یہ ہے کہ مدرس کے اندر اس بات کی حرص ہونی چاہیے کہ طلباء جو میرے پاس امانت ہیں، میں نے ان کی طرف علم منتقل کرنا ہے۔ کنز کے بعد ''شرح الوقایہ'' میں چونکہ دلائل بھی آئیں گے، اس لیے دلائل بھی بخوبی سمجھائے، اس کے بعد ہدایہ پڑھائی جاتی ہے جو درجے میں گویا سپریم کورٹ ہے۔

براہینِ قاطعہ برانوارِ ساطعہ:

مولانا عبدالسمیع رامپوری شاعر بھی تھے اور مجدد البدعات بھی۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے بدعات کو مدلل کیا۔ اسی کی ایک کتاب ''انوارِ ساطعہ'' ہے، جس کا جواب حضرت سہارنپوریؒ نے ''براہینِ قاطعہ'' کے نام سے دیا تھا۔ اس شخص نے بدعات کو دلائل کے ساتھ تحریر کیا، پھر حضرت سہارنپوریؒ نے بھی کمال کا جواب لکھا۔ یاد رکھیے اہل السنّت والجماعت کا سنت و بدعت کے بارے میں موقف آپ کو اس وقت تک معلوم نہیں ہوگا، جب تک آپ حضرت سہارنپوریؒ کی اس کتاب کو صحیح طرح سمجھ کر نہیں پڑھیں گے، یہ حضرت سہارنپوری کی بڑی عظیم کتاب ہے۔

مولوی کی دو تعریفیں:

مولوی کی دو تعریفیں ہیں ایک تو وہ ہے جو ''حمد باری'' کے مصنف مولانا عبدالسمیع رامپوری نے کی ہے۔ ''حمد باری'' رسالہ تو ہم نے نہیں پڑھا، البتہ حضرت والد ماجدؒ اس کی بہت تعریف کیا کرتے تھے کہ اس نے بہت سی لغات جمع کی ہیں، اس کتاب میں یہ لکھا ہے

علم مولا ہو جسے ہے مولوی　　جیسے حضرت مولوی معنوی

حضرت مولوی معنوی سے مولانا رومی کی طرف اشارہ بلکہ صراحت ہے، ایک تعریف تو مولوی کی یہ ہے۔ اب دیکھیے مولوی کے اندر کتنی بڑی نسبت ہے لیکن اب یہ صورت حال ہوگئی ہے کہ اگر مولوی کہہ دیا جائے تو باقاعدہ طور پر

احتجاج ہوتا ہے کہ مجھے مولوی کہا گیا ہے، میرے لیے مولانا یا علامہ یا اس طرح کا کوئی بڑا لقب ہونا چاہیے۔

القابات کا صحیح استعمال:

بادشاہ نے ایک حجام کو استاد کا لقب دیا۔ قصہ یوں ہوا کہ بادشاہ سویا ہوا تھا۔ اس نے آ کر بادشاہ کی سوتے ہوئے حجامت کر ڈالی، بادشاہ نے حجام کو طلب کیا اور کہا جناب آپ اس فن میں بڑے ماہر ہیں، آج سے میں تمہیں استاد کا خطاب دیتا ہوں۔ خواتین کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ اس حجام کے گھر مبارکباد دینے پہنچ گئیں اور مبارکباد دینے لگیں۔ حجام کی بیوی نے پوچھا کس بات کی مبارکباد؟ ان عورتوں نے کہا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے شوہر کو استاد کا لقب دیا گیا ہے۔ کہنے لگی کس نے دیا ہے؟ انہوں نے کہا بادشاہ نے دیا ہے۔ وہ کہنے لگی: کیا بادشاہ حجام ہے؟ انہوں نے کہا بادشاہ کیوں حجام ہوگا وہ تو بادشاہ ہے۔ تو وہ کہنے لگی پھر بادشاہ صاحب کو کیا پتہ کہ یہ کیا پیشہ ہے؟ اگر اسی پیشہ سے منسلک افراد جمع ہو کر یہ فیصلہ کریں کہ یہ ہمارا استاد ہے پھر تو وہ استاد ہوگا، بادشاہ کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ تو یہ علامہ، مولانا وغیرہ کے جو جامع مانع لقب دیے جا رہے ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے۔ خیر مولوی بہت بڑا لفظ ہے، اس کی یاء نسبت کی ہے یعنی اللہ والا، پہلے حضرات کا طریقہ بھی یہی تھا کہ اسی طرح علماء کو پکارتے۔

دوسری تعریف حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ فرماتے تھے کہ مولوی وہ ہے جس کے سامنے ہدایہ کی چار جلدیں رکھی جائیں، اور جس جگہ سے پوچھا جائے اور وہ اس جگہ کو بلا تامل اور صحیح حل کر دے۔ یوں ہدایہ آنی چاہیے تب فائدہ بھی ہے پڑھنے پڑھانے کا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی تواضع:

حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیعؒ کے ایک ساتھی نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت مولانا معین الدین جو اجمیر کے بہت بڑے عالم گزرے ہیں، منطق و فلسفہ کے بھی بہت بڑے امام تھے۔ ان کے دل میں حضرت شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ دیوبند تشریف لائے، اسٹیشن پر آ کر حضرت کے بارے میں پوچھا تو تانگے والے نے کہہ دیا کہ مولانا وغیرہ تو یہاں کوئی نہیں ہے، البتہ ایک بڑے مولوی صاحب ہیں، اگر آپ کہیں تو وہاں پہنچا دوں؟ کہنے لگے اچھا بھائی! وہاں پہنچا دو۔ وہاں پہنچ گئے، دروازے پر دستک دی، اندر سے ایک صاحب تشریف لائے جنہوں نے تہبند باندھا ہوا تھا، باقی کپڑے اتارے ہوئے تھے، یہ بہت بڑا سفر کر کے وہاں پہنچے تھے۔ گرمی کا موسم تھا، انہوں نے اپنے کچے سے گھر کی بیٹھک میں ان کو بٹھا لیا۔ اندر سے شکر یا گڑ کا شربت لا کر پیش کیا کہ گرمی بہت ہے، یہ پی لیں۔ وہ تقاضا کرنے لگے کہ حضرت کو میرے آنے کی جلدی اطلاع کرو تا کہ ملاقات ہو جائے۔ وہ فرمانے لگے اطلاع ہو گئی ہے۔ پھر

پنکھا لیا اور ہاتھ سے ان کو ہوا دینے لگے انہوں نے کہا میں کب سے آیا ہوں، آپ بھی عجیب آدمی ہیں، ان سے میری ملاقات نہیں کروار ہے۔ جلدی میری ملاقات کرواؤ ان سے۔ حضرت نے فرمایا کہ مولانا تو یہاں کوئی نہیں البتہ بندہ محمود حسن خاکسار ہی کا نام ہے۔ مولانا معین الدین یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے۔

ہدایہ کی ایک عبارت کا حل:

تیس سال سے زائد ہو گئے، حضرت مولانا مشرف علی تھانوی مدظلہم ساہیوال تشریف لائے۔ شدید گرمی تھی۔ فرمایا: ہدایہ لاؤ۔ میں سوچنے لگا کہ پہلے شدید گرمی ہے اوپر سے ہدایہ کا امتحان نہ شروع ہو جائے۔ میں ہدایہ لایا تو حضرت مدظلہ نے ہدایہ کھول کے حضرت والد صاحب کے آگے رکھ دی، اور فرمایا کہ اس عبارت کا مطلب کیا ہے ؟ شدید گرمی تھی، اس زمانے میں ائیر کولر وغیرہ جیسی کوئی چیز نہ تھی، اور پنکھا چلانے کی حضرت والد صاحب کے ہاں اس طرح اجازت تھی کہ پنکھے کے پَر نظر آ سکیں۔ فرماتے تھے کہ پسینہ نکلنا چاہیے، کہیں مسام بند نہ ہو جائیں۔ ان بزرگوں کے ہاں صحت کا بھی خیال تھا۔ تو ابا جی نے وہ عبارت دیکھی اور اس کی تشریح فرمائی، تو مولانا مشرف علی صاحب بہت خوش اور حیران ہوئے۔ فرمانے لگے: میں نے بہت سے حضرات سے اس کا مطلب پوچھا، سوائے حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے کسی نے اس کو صحیح حل نہیں کیا، آپ دوسرے شخص ہیں جو اس کو صحیح حل کر پائے ہیں۔

صحت کا خیال ضروری ہے:

حضرت تھانوی صاحب کے پاس ایک آدمی گئے، کہنے لگے: حضرت سر میں درد ہے، کوئی علاج بتائیں۔ حضرت نے فرمایا بھائی سر میں تیل لگاؤ۔ وہ کہنے لگا کہ حضرت رومال خراب ہو جائے گا۔ حضرت نے فرمایا دماغ بے شک خراب ہو جائے لیکن رومال خراب نہ ہو۔

معاملات کی اہمیت:

ایک بڑی اہم بات یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جو حضرات پڑھائیں وہ ماہر ہونے چاہیے۔ خاص طور پر جو بیوع اور معاملات کے ابواب ہیں، وہ بڑے اہم ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا "**لا یبیع فی سوقنا من لم یتفقه فی الدین**" اس شخص کو بازار میں بیٹھنے کی اجازت نہیں جو مسائل نہ جانتا ہو۔

محشر میں مال کا سوال:

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ اگر مسلمانوں اور کافروں کے معاملات کو دیکھا

جائے تو کوئی فرق ہی معلوم نہیں ہوتا، جیسے وہ کر رہے ہیں مسلمان بھی اسی طرح کر رہے ہیں، حلال وحرام کی تمیز نہیں۔ حالانکہ حدیث میں آتا ہے کہ جب تک ابنِ آدم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اس وقت تک قدم ہلانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہاں تو اس بات کی پرواہ ہی نہیں کہ حلال ہے یا حرام، حالانکہ حلال کے اندر اتنی برکت ہے۔

سلطان عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی وزیر کو تنبیہ:

سلطان عالمگیرؒ وضو فرما رہے تھے۔ ان کے ایک بڑے وزیر بھی پاس تھے۔ سلطان عالمگیرؒ نے ان وزیر صاحب سے وضو یا نماز کا ایک مسئلہ دریافت کیا۔ (میں یہ سلطان عالمگیرؒ کے زمانے کی بات کر رہا ہوں، موجودہ زمانے کی بات نہیں کر رہا۔ یہاں کوئی وضو کا تصور ہے؟ یہاں تو تیمّم ہی نہیں وضو تو بعد کی بات ہے) خیر انہوں نے اپنے وزیر سے مسئلہ پوچھا، وزیر صاحب کو نہ آیا۔ سلطان عالمگیرؒ نے ان کو بہت ڈانٹا کہ تجھے مسئلہ نہیں آتا۔ بس پھر ان کے کان کھڑے ہو گئے اور پھر سب حضرات متحرک ہو گئے، طلباء اور علماء کی خوب قدر ہوئی اور ماشاء اللہ انہوں نے خوب مسائل سیکھے۔

علوم میں پختگی ہونی چاہیے:

ایک صاحب کا انٹرویو تھا۔ ان سے سوال ہوا کہ حج کی کتنی قسمیں ہیں؟ کہنے لگے کہ تین قسمیں ہیں۔ حجِ افراد، حجِ تمتع اور حجِ قران۔ پوچھا گیا کہ ان کی وضاحت کریں۔ کہنے لگے کہ حجِ افراد کا مطلب یہ ہے کہ اکیلے حج کرنا، اور حجِ تمتع کا مطلب یہ ہے کہ کچھ کھانا پینا اور قران کا مطلب ہے کہ مل جل کر حج کرنا۔

ہمارے علماء مختلف محکموں میں انٹرویو کی زد میں آجاتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ تأثر ہوتا ہے کہ مولویوں اور عالموں کو کچھ نہیں آتا۔ اصل میں وہاں کوئی صحیح اور قابل آدمی جاتا ہی نہیں۔

عربی فاضل کا امتحان:

۱۹۸۶ء کی بات ہے، میں حضرت والد صاحب کو اطلاع کیے بغیر عربی فاضل کا امتحان دے رہا تھا۔ انٹرویو میں انہوں نے فقہ، اصولِ فقہ اور ادبِ عربی کے مسائل پوچھے۔ ہمارا جوانی کا دور تھا، ہم نے بھی تیزی دکھائی، الحمدللہ ہر سوال کا جواب دیا۔ وہ لوگ بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے آپ نے درسِ نظامی تو نہیں کیا؟ میں نے کہا: جی کیا ہے۔ کہنے لگے اب کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا: پڑھاتا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے عربی میں پانچ منٹ تقریر بھی کروائی تھی۔ کہنے لگے: آپ اپنا پسندیدہ شعر سنا دیں۔ میں نے متنبّی کا شعر پڑھا۔

تحریری وتقریری امتحان:

پڑھاتے وقت طلباء سے سوال وجواب بھی ہوں بلکہ اس طرح کیا جائے کہ ہر ہفتہ طلبہ جو پڑھتے ہیں اس کے مضامین کے متعلق سوال وجواب کی نشست ہوجائے۔اگر نشست نہ ہوتو تحریری سوال وجواب ہی ہوجائیں تاکہ ان کو پتہ چلے کہ ہم نے کیا پڑھا ہے؟ تقریری امتحان کے بھی فوائد ہیں وہ ضرور ہونا چاہیے،اس سے طلبہ کی استعداد کا بھی پتہ چلتا ہے۔تقریری امتحان میں حافظے کا امتحان ہے اور تحریری امتحان میں طالب علم کی لیاقتوں اور صلاحیتوں کا علم ہو تا ہے۔

قواعد کی عملی تطبیق:

سہارنپور مدرسے کے ساتھ ایک دکان تھی۔مدرسے کے ایک طالب علم کو اس دکان میں ایک ٹوپی پسند آ گئی۔طالب علم،دکاندار سے کہنے لگا کہ یہ ٹوپی آپ مجھے دیدیں۔اس نے کہا پیسے؟ طالب علم کہنے لگا بعد میں لے لینا ،فی الحال میرے پاس نہیں۔اس ٹوپی پر زری کا کام ہوا تھا،اور یہ بیع صرف تھی۔دکاندار کہنے لگا: مولوی صاحب آپ کتابیں پڑھتے ہیں،آپ کو پتہ نہیں کہ بیع صرف کے اندر ادھار جائز نہیں۔

مولوی صاحب نے پڑھا تو تھا لیکن اس کی عملی تطبیق سمجھ نہیں آ رہی۔طالب علم نے کہا میرے پاس پیسے جو نہیں ہیں۔بعد میں جب پیسے ہوں گے تو پھر میں یہ ٹوپی لے لوں گا۔دکاندار نے کہا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔میں آپ کو طریقہ بتاتا ہوں۔وہ یہ کہ آپ مجھ سے یہ پیسے ادھار لے لیں،اور ان پیسوں سے آپ ٹوپی نقد خرید لیں۔دیکھیے !دوکان دار ہے اور دوکان دار ہونے کے باوجود مسائل کا علم ہے۔اور ساتھ میں یہ حیلہ بھی بتادیا کہ اس کا متبادل یہ ہے۔

رسالہ ''صفائی معاملات'' کی افادیت:

اس متبادل کے لیے حضرت حکیم الأمت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بہت زبردست رسالہ لکھا ہے۔جو حضرات قدوری پڑھانے والے یہاں تشریف فرما ہیں۔ان سے میں یہ گزارش کروں گا کہ قدوری کی کتاب البیوع سے پہلے حضرت تھانوی کا ایک زبردست رسالہ صفائی معاملات ضرور پڑھیں۔اس کی روشنی میں آگے چلیں۔اس کے اندر کئی معاملات کے متبادل لکھے ہیں۔مثلا بیع فاسد،بیع باطل کا متبادل کیا ہے؟ اور بیوعات کے اندر مسلمان کیسے جائز طریقے اختیار کر سکتے ہیں؟

مدرّس کومعاملات سے باخبر رہنا چاہیے:

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بازاروں میں جاتے اور لوگوں سے پوچھتے تم معاملات کیسے کرتے ہو؟ اس سے معلوم ہوا ایک عالم اور مدرس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آج کل معاملات کی کیا صورتیں ہیں؟ تاکہ طلباء کو ان سے مستفید کرنے کا موقع مل سکے۔ ان کو معلوم ہو کہ کس طرح معاملات کیے جانے چاہییں؟ یہ بیع باطل ہے یہ فاسد ہے، مکروہ ہے، حرام ہے، یہ اجارہ ہے، خیارِ عیب ہے، خیارِ رؤیت ہے۔ یہ ساری تفصیلات صرف ذہن کی حد تک نہ رکھیے بلکہ طلباء کے سامنے عملی طور پر یہ باتیں آنی چاہییں۔ یہ نہ ہو کہ جب وہ فارغ ہوں تو بالکل ہی فارغ ہوں ؎

مولوی گشتی و آگاہ نیستی　　　　از کجا و خود کجا و کیستی

ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو ساری تفصیلات معلوم ہونی چاہییں۔

ایک نکتہ اور ایک لطیفہ:

علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد حضرت مولانا فتح محمد صاحب لکھنوی رحمہ اللہ کی فقہ المعاملات پر کتاب ہے "تطهير الأموال في الحرام والحلال"۔ في الحلال والحرام نہیں ہے بلکہ قافیہ کی رعایت کرتے ہوئے "في الحرام والحلال" ہے۔ ایک صاحب جا رہے تھے، دوسرے سے کہنے لگے جاٹ رے جاٹ تیرے سر پہ کھاٹ اس نے جواب میں کہہ دیا تیلی رے تیلی تیرے سر پہ کولہو، وہ کہنے لگا قافیہ نہیں مل رہا، اس نے کہا قافیہ نہیں مل رہا تو نہ ملے، بوجھ میں تو مرے گا۔ "تطهير الأموال في الحرام والحلال" معاملات کے حوالے سے بڑی اچھی کتاب ہے۔

قدیم کتب سے جدید مسائل کا استنباط:

جدید معاشی مسائل اور معاملات کے حوالے سے جو کام ہمارے حضرات نے مکمل کیا ہے، وہ سارا کام اہلِ علم کے سامنے ہونا چاہیے۔ اس نہج پر آپ طلبہ کو ڈال دیں تو فائدہ ہوگا۔ ان کو ضروری ضروری چیزیں سمجھائیں اور معاملات کر کے دکھائیں، جس سے ان پر معاملات صحیح ظاہر ہوں۔ جب طلبہ قرآن وسنت کی روشنی میں فقہ کے حوالہ سے بات کریں گے تو ان کو متبادل نظام اور متبادل حل سمجھ میں آ جائے گا۔ فقہاء نے سب چیزیں کتابوں میں لکھ دی ہیں۔ بڑے سے بڑے علماء جب بھی کسی معاملے پر گفتگو کرتے ہیں یا تحریر لکھتے ہیں تو کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اس میں حوالے کہاں سے لاتے ہیں؟ دورِ جدید کی تو کچھ ہی کتابیں ان کے سامنے ہیں، فقہاء کی قدیم کتابوں کے حوالوں کی

بھرمار ہوتی ہے۔کوئی ''بدائع الصنائع'' کا حوالہ دے رہا ہے کوئی ''فتح القدیر'' کا کوئی ''البحر الرائق'' کا،اسی طرح ان کتابوں کے علاوہ ''شامی'' اور عالمگیری کے حوالے بھی دیں۔فقہاء کرامؒ نے ان عبارتوں میں اصول لکھ دیے ہیں الحمدللہ۔

اجتہاد کے لیے شرائط کا تحقق ضروری ہے:

اگر آپ کو اجتہاد کی ضرورت پیش آئے اور شرائط کا تحقق ہو تو آپ اس سے بھی دریغ نہ کریں۔لیکن یہ جب ہی ہے کہ شرائط کا تحقق ہو واذا فات الشرط فات المشروط۔اجتہاد ان مسائل میں ہوگا جو جدید ہوں۔بہرحال میں یہی کہوں گا کہ ان کتابوں کو اگر سمجھ کر پڑھ لیا جائے جو جدید فقہاء کی کتابیں ہیں،جن کا تعلق فقہ اور اصولِ فقہ سے ہے تو آپ قیامت تک مار نہیں کھا سکیں گے،ان شاءاللہ۔

حیاتِ شہداء:

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:**وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔**(البقرۃ:۱۵۴)

ترجمہ:اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مردے ہیں کہ بلکہ وہ تو (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں لیکن تم (ان) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے۔(بیان القرآن)

حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے خود سنا بھی ہے اور حضرت نے اس کو بڑی وضاحت سے لکھا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرما رہے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کر دیا گیا اس کو مردہ مت کہو۔''**لاتقولوا**'' نہی کا صیغہ ہے اور نہی حرمت کے لیے ہے۔**لاتقولوا** یہ قول ہے جس کا مقولہ جملہ ہوتا ہے۔اب ''اموات'' جملہ تو نہیں بلکہ اصل میں یہ تھا **هم اموات** یعنی **ولاتقولوا لمن يقتل فی سبيل الله هم اموات** تو یہ جملہ اسمیہ ہے اور جملہ اسمیہ دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ تم ان کو یہ نہیں کہہ سکتے جو اللہ کے راستے میں شہید ہو جائیں کہ یہ دوامی شکل پر مردہ ہیں اور پھر فرمایا **بل احياء** یہ اصل میں **بل قولوا هم احياء** ہے یعنی بلکہ جس طرح ان کو مردہ کہنا جرم ہے اسی طرح ان کو زندہ کہنا واجب ہے۔

اس طرح شہداء کی حیات بالکل عبارۃ النص سے ثابت ہوگئی۔اب دلالۃ النص کے ذریعے بات کو آگے بڑھائیں کہ جن کا درجہ شہداء سے بھی زیادہ ہے،ان کا کیا حال ہوگا؟

تفسیر القرآن بالقرآن:

اگر قرآن پاک کی تفسیر قرآن ہی سے ہو جائے تو یہ تفسیر کا پہلا درجہ ہے۔اس پر یاد آیا کہ ایک صاحب اجتماع میں بیٹھے ہوئے کہہ رہے تھے کہ آؤ میں تمہیں قرآن پاک کی تفسیر سناؤں گا،اور وہ تفسیر القرآن بالقرآن ہوگی۔اس نے قرآن پاک کی تفسیر اس طرح کی: **بسم اللہ الرحمن الرحیم،الحمدللہ رب العالمین** یعنی **الحمدللہ رب العالمین** ،اس طرح ساری سورت پڑھ دی اور پھر کہا دیکھو یہ تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔

تو قرآن پاک کی اول درجہ کی تفسیر تو وہ ہے جو قرآن پاک سے ہو۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ،صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ.** (الفاتحہ)

منعم علیہم کون ہیں؟ دوسری جگہ فرمایا **وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَاءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ۔** (النساء:۶۹)

ترجمہ: اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء۔(بیان القرآن)

آیت کا شانِ نزول:

اس آیت کے شانِ نزول میں علامہ واحدی نے تحریر کیا ہے کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا رنگ بدلا ہوا ہے اور تمہاری طبیعت بھی کمزور لگ رہی ہے۔کہنے لگے یا رسول اللہ اور تو کوئی معاملہ نہیں لیکن جب آپ کی محفل سن کے جاتا ہوں تو پھر میں آپ مشتاق ہو جاتا ہوں۔دل میں یہ آتا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں پہنچ جاؤں۔اور یہ بھی سوچتا ہوں کہ مرنے کے بعد اگر جنت میں چلا گیا تو آپ کا مقام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوگا،پھر آپ کی زیارت کیسے ہوگی؟ اور اگر زیارت نہ ہوگی تو جنت میں جانے کا کیا فائدہ؟ کتنی گہری سوچ ہے،تو جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی تو جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَاءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسلام لانے کے بعد جتنی خوشی اس آیت کے نازل ہونے پر ہوئی،کسی چیز سے نہیں ہوئی۔اس لیے کہ اس میں یہ بشارت دی جا رہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت ان کو جنت میں بھی

نصیب ہوگی۔حقیقت میں یہی عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین واقعۃً اعلی درجے کے عاشقِ رسول تھے۔حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کو جب پتہ چلا کہ آپ کا وصال ہوگیا ہے تو دعا کی کہ یااللہ مجھ سے نظر چھین لیجیے۔میں اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نہیں دیکھنا چاہتا۔

چھین لے مجھ سے نظر اے جلوہ جوش روئے دوست
میں کوئی محفل نہ دیکھوں اب تیری محفل کے بعد

حیاتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام:

اس آیت میں جو درجات بیان کیے گئے ہیں،ان میں پہلا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے،دوسرا صدیقین کا،تیسرا شہداء کا اور شہداء کے بارے میں فرمایا کہ وہ زندہ ہیں اور زندہ صرف روح کو نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ روح تو سب کی زندہ ہے۔یہ حیاتِ جسمانی ہوگی اور روح کے تعلق سے ہوگی۔تو جب وہ زندہ ہیں تو ان سے بھی اعلی درجہ پر انبیاء ہیں اور وہ بھی یقیناً زندہ ہوں گے اور جناب سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جو سب کے سردار ہیں وہ تو یقیناً حیّ اور زندہ ہوں گے۔اور چوتھا درجہ صالحین یعنی اللہ کے نیک بندوں کا ہے۔

اصولِ فقہ کی تدریس کا طریقہ:

جب اصولِ فقہ پڑھائے جائیں تو تیسیر کے ساتھ اچھے انداز میں پڑھائے جائیں،سمجھانے کے لیے ساتھ مثالیں بھی دی جائیں۔صرف اسی کتاب میں درج مثالیں کافی نہیں بلکہ دوسری کتابوں سے بھی مراجعت کریں اور طلباء کا ذہن اور دماغ آگے بڑھائیں۔''نورالانوار'' میں تو بہت تفصیل ہے۔ملاجیونؒ تو ایسا طویل کلام فرماتے ہیں کہ حد نہیں اور توضیح وتلویح کا معاملہ تو آپ کے سامنے ہے۔اسی لیے علامہ گازرونی نے فرمایا تھا کہ:

ینبغی أن یسمّی جرحا لا شرحا

اس کو جرح کہنا چاہیے شرح نہیں کہنا چاہیے،اس لیے کہ وہ کتاب پڑھ کر بھی طلباء کو کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

اختتامی کلمات:

یہ چند باتیں اور پریشان خیالات حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پیش کردیے ہیں۔جو کوتاہیاں ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے،جو کوئی مفید بات ہے اس کو اللہ تعالیٰ میرے لیے اور آپ کے لیے نافع فرمائے۔**وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔**☆☆

علماء اور مدارس عبادت کے ذرائع ہیں
اور قیامت تک باقی رہیں گے

مولانا شاہ عالم گورکھپوری

قال اللہ فی کتابہ العزیز " اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو "اللہ وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا معبود ہونا بیان کیا گیا ہے کہ عبادت کے لائق صرف اسی کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے عقل وفہم میں وہ قوت نہیں دی کہ اس کی ذات کی حقیقت تک انسان رسائی حاصل کر سکے؛ البتہ اس کی پہچان کے لیے کچھ صفات ہیں جن کے ذریعہ انسان اپنے فہم وفراست سے اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) صفات ثبوتیہ، جنہیں صفات جمالیہ بھی کہا جاتا ہے اور اسی کو علامہ تفتازانی صاحبِ شرح عقائد نے صفات ازلیہ سے تعبیر کیا ''ولہ صفات ازلیۃ''

(۲) صفات سلبیہ، جنہیں صفات جلالیہ بھی کہا جاتا ہے۔

صفات ثبوتیہ:.....صفات ثبوتیہ ان صفات کو کہا جاتا ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ماننا لازم ہو۔ یہ آٹھ ہیں: علم، قدرت، سمع، بصر، حیات، کلام، ارادہ، مشیت اور تکوین۔ یہ صفات نہ عین اللہ ہیں نہ غیر اللہ ہیں۔

صفات سلبیہ:.....صفات سلبیہ ان صفات کو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے جن کی نفی کرنی ضروری ہو۔ جیسے " **اللّٰہ لیس بجسم، اللّٰہ لیس بعرض** "وغیرہ۔

صفات ثبوتیہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) محکمات (۲) متشابہات

محکمات:.....محکمات ان صفات کو کہتے ہیں جن کا معنی معلوم ہو جیسے علم، قدرت، سمع، بصر وغیرہ۔

متشابہات:.....متشابہات ان صفات کو کہتے ہیں جن کا معنی معلوم نہ ہو۔ صفات متشابہات دو طرح کی ہوتی ہیں:

(۱).....غیر معلوم المعنی غیر معلوم المراد یعنی جن کا معنی لغوی اور معنی مرادی کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ جیسے " **الٓمٓ، حٰمٓعٓسٓقٓ، حٰمٓ** "

(۲) معلوم المعنی غیر معلوم المراد یعنی معنی لغوی تو معلوم ہو؛ لیکن معنی مرادی معلوم نہ ہو۔ جیسے " **ید اللّٰہ، وجہ**

اللّٰہ، ساق اللّٰہ"

آمدم برسر مطلب!......اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں عبادت کے لائق صرف وہی ہے۔ اس کا معنی اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ رہے گا، اللہ پر کبھی فناء طاری نہیں ہوگی۔ خود لفظ ''اللہ'' سے بھی یہی بات مفہوم ہوتی ہے؛ اس لیے کہ اللہ نام ہے ذات واجب الوجود کا جیسا کہ درس نظامی میں شامل علم کلام کی مشہور کتاب ''شرح عقائد'' میں ہے: **والمحدث للعالم هو اللّٰه أی الذات الواجب الوجود"** کہ تمام عالم کو پیدا کرنے والا اللہ یعنی ذات واجب الوجود ہے۔ واجب الوجود کا اطلاق اس ذات پر ہوتا ہے جس کا ہمیشہ موجود رہنا ضروری ہو اور اس کے اوپر عدم کا طاری ہونا محال ہو؛ چنانچہ اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ محمد عبدالعزیز پرہارویؒ فرماتے ہیں:

''**فسر اسم اللّٰه سبحانه بالواجب لأن كون الحق سبحانه مبدعا للمحدثات كلها ومبدء سلسلة الممكنات بأجمعها وموصوفا بالوحدة والقدم...... انماهو من حيث كونه واجب الوجود"** (النبراس شرح شرح عقائد، ص:۹۶۔۹۷)

ترجمہ: شارحؒ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تفسیر لفظ ''واجب'' سے اس لیے کی ہے کہ حق تعالیٰ تمام مخلوقات کو انوکھے طرز پر پیدا کرنے، جمیع ممکنات کو ایجاد کرنے اور قدم ووحدت کی صفت سے متصف ہونے کی وجہ سے ایسے ہیں کہ ان کا ہمیشہ ہمیشہ موجود رہنا ضروری ہے۔

علامہ مصلح الدین مصطفیٰ بن محمد القسطلانی، الرومی، الحنفیؒ المعروف بہ ''کستلی'' فرماتے ہیں:

"**قوله: (اى الذات الواجب) يريد أن هذا الفظ وان كان وضعه بازاء ذات الواجب الوجود لكن لما كان امتياز ذلک عندنا بوصف الألوهية، صار قولنا: (اللّٰه) بمنزلة أن يقول: الذات الموصوف بالألوهية، والألوهية على ما صرح به، عبارة عن وجوب الوجود القدم الذاتی**"(المجموعۃ السنیۃ علی شرح العقائد النسفیۃ، ص:۲۰۸،۲۰۹)

ترجمہ: شارحؒ نے اپنے قول ''ذات واجب الوجود'' سے یہ مراد لیا ہے کہ لفظ اللہ اگرچہ اس ذات کے لیے وضع کیا گیا ہے جو واجب الوجود ہو لیکن ہمارے یہاں اس کا امتیاز صفت الوہیت سے متصف ہونا ہے۔ اب ہمارا قول ''اللہ'' اس درجہ میں ہوگا کہ کہا جائے گا کہ اللہ اس ذات کا نام ہے جو صفت الوہیت سے متصف ہے اور الوہیت'' جیسا کہ بیان کیا گیا'' قدم ذاتی اور وجود کے ہمیشہ ہمیش رہنے کا نام ہے۔

علامہؒ کے قول ''**وان كان وضعه بازاء ذات الواجب والوجود**'' سے یہ بات بالکل صاف ہوگئی کہ لفظ

''اللہ'' کا حقیقی معنیٰ ''ذات واجب الوجود'' ہے۔یعنی جس کا ہمیشہ موجود رہنا ضروری ہو اور جس کی ہمیشہ ہمیش عبادت کی جائے۔اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے؛ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

''وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون'' کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات صاف ہوگئی کہ عبادت اللہ کی کی جائے گی، عبادت کرنے والے انس وجن ہوں گے اور چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیشہ موجود رہیں گے اس لیے جب تک ان کی مرضی ہوگی انسان وجنات ان کی عبادت کرتے رہیں گے یعنی ان کی عبادت کرنے والے افراد اس روئے زمین پر موجود رہیں گے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہماری کمزور نگاہوں سے اوجھل ہیں، نہ تو ہم اللہ کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی سن سکتے ہیں، تو پھر اللہ کی عبادت کیسے (کن طرق وافعال کے ذریعے) کی جائے؟۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی معمہ کو حل کرنے کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام اور کتب مقدسہ کا پاکیزہ سلسلہ شروع فرمایا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو چکا۔اللہ کے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس کی تعلیم دی، صحابہؓ نے تابعینؒ کو، تابعین نے تبع تابعین کو، انہوں نے محدثین وفقہاء کو، محدثین وفقہاء نے علماء کو۔اس طرح سینہ بہ سینہ یہ علم اور عبادت کا طریقہ ہم تک پہنچا۔عصر حاضر میں جس جگہ اس کی تعلیم ہوتی ہے اور جو لوگ اس کی تعلیم دیتے ہیں انہیں مسجد، مدرسہ علماء فضلاء اور حفاظ کے نام سے معنون ومنسوب کیا جاتا ہے۔

اتنی بات تو طے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ رہیں گے، جب تک چاہیں گے انسانوں کو باقی رکھیں گے اور ان سے عبادت کا کام لیتے رہیں گے۔جب یہ دونوں باتیں طے ہیں تو یہ بھی متیقن ہے کہ جن ذرائع سے اللہ کی عبادت کا طریقہ بتایا جاتا ہے اور جو لوگ طریقہ بتاتے ہیں وہ بھی ہمیشہ رہیں گے۔ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ زمانوں میں بھی انہیں کسی اور نام سے معنون ومنسوب کیا جانے لگے۔جیسے ان ہی ذرائع کو دور اوّل میں نبی اور پیغمبر سے بتانے کی خاص جگہ کو دور نبویؐ میں صفہ کہا جاتا تھا، مابعد کے زمانے میں ان ذرائع کو مختلف ناموں سے جانا گیا اور اب اس زمانے میں عالم، مفتی، حافظ، قاری اور بتانے کی جگہوں کو مدرسہ، مسجد، کے نام سے جانا جاتا ہے اسی طرح ممکن ہے کہ بعد میں ان کا کچھ اور نام ہو جائے۔حاصل کلام یہ ہے کہ نام میں اگرچہ تبدیلی ہو جائے جیسا کہ ماضی میں تبدیلی ہوتی آئی ہے، لیکن ذرائع تا قیامت باقی رہیں گے اور جو لوگ بھی ان کے مٹانے کے درپے ہوں گے وہ خود مٹ جائیں گے، لیکن ان پر کسی طرح کی آنچ نہیں آئے گی، اس لیے کہ یہ ذرائع مٹ گئے تو اللہ کی عبادت کا طریقہ اپنے بعد والوں کو کوئی بتانے والا نہیں رہے گا اور جب یہ سلسلہ نہیں رہے گا تو اس کے بغیر اللہ کی عبادت ناممکن ہوگی اور جب اللہ کی عبادت نہیں ہوگی تو نعوذ باللہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی معبودیت پر حرف آئے گا۔

ایک سوال:..... مدارس ومساجد اور علماء وفضلاء عبادت یا اللہ کی معبودیت کے لیے سبب کے درجہ میں ہیں، لہٰذا یہ ذرائع سبب ہوئے اور عبادت مسبّب اور سبب کے فوت ہونے سے مسبّب کو فوت ہونا لازم نہیں آتا، اس لیے اگر یہ مدارس اور علماء نہیں رہے تو اس سے عبادت یا اللہ کی معبودیت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ مدارس و مساجد فنا ہو سکتے ہیں۔

جواب:.....**اولاً**: ان ذرائع اور عبادت کے درمیان سبب مسبّب کا نہیں، بلکہ موقوف اور موقوف علیہ کا علاقہ ہے۔ عبادت موقوف ہے اور یہ ذرائع موقوف علیہ۔ اور موقوف کی بقاء کے لیے موقوف علیہ کی بقا شرط ہوتی ہے، ثابت ہوا کہ مدارس ومساجد اور علماء وفضلاء کا باقی رہنا ضروری ہے۔

ثانیاً: سبب کی دو صورتیں ہیں: (۱) مسبب سبب کے ساتھ خاص نہ ہو۔ جیسے لفظ ''عتـــق'' اور ''زوال ملک متعہ'' اس مثال میں لفظ ''عتق'' زوال ملک متعہ کے لیے سبب ہے؛ لیکن ضروری نہیں ہے کہ ''عتق'' کے ساتھ ہمیشہ زوال ملک متعہ ہو۔ جیسے اگر مولیٰ اس لفظ کو باندی کی طرف منسوب کرے تو زوال ملک رقبہ کے واسطے سے زوال ملک متعہ ہوگا، لیکن اگر یہی لفظ غلام کے لیے استعمال کرے تو صرف زوال رقبہ ہوگا زوال ملک متعہ نہیں۔

(۲) مسبّب سبب کے ساتھ خاص ہو۔ جیسے خمر (شراب) اور عنب (انگور)۔ اس مثال میں ''عنب'' خمر کے لیے ایسا سبب ہے جس کے ساتھ مسبّب (خمر) خاص ہے؛ کیونکہ احناف کے یہاں خمر کا اطلاق صرف کچے شیرہ انگور پر ہی ہوتا ہے۔

پہلی صورت میں (جب مسبب سبب کے ساتھ خاص نہ ہو) دونوں میں سے ایک کی نفی دوسرے کی نفی کو مستلزم نہیں ہوتی؛ لیکن دوسری صورت میں (جب مسبّب سبب کے ساتھ خاص ہو) ایک کی نفی دوسرے کی نفی کو مستلزم ہوا کرتی ہے (خلاصۃ نامی شرح حسامی ص:۳۱، نور الانوار بحث: علاقہ مجاز)۔ بالفرض اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ عبادت اور ذرائع عبادت میں سببیت کا علاقہ ہے تو یہاں سبب کی دوسری صورت مراد ہوگی۔ یعنی ذرائع عبادت کے فوت ہونے سے نفس عبادت کا فوت ہونا لازم آئے گا۔

ثالثاً: سوال میں مذکورہ قاعدہ اس سبب کے بارے میں ہے جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔ زیر بحث مسئلہ میں مدارس ومساجد یا علماء وفضلاء کو سبب انسانوں نے نہیں بلکہ خدا نے قرار دیا ہے اور خدا کے متعین کردہ سبب میں یہ قاعدہ جاری نہیں ہوگا۔.....اب یہاں ایک بات رہ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح مدارس ومساجد اور علماء وفضلاء کو سبب بنانے پر قادر ہے اسی طرح ان کے علاوہ دیگر اشیاء کو بھی سبب بنانے پر قادر ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ دو ممکنہ صورتوں میں سے جب ایک کو متعین کرلیا جائے تو دوسری صورت کالعدم شمار ہوتی ہے اور اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا چہ جائے کہ اس کو بنیاد بنا کر معینہ صورت پر اعتراض کیا جائے۔ ☆☆

فضلاءِ کرام کی خدمت میں چند گزارشات

شیخ الحدیث مولانا زبیر احمد صدیقی

برِصغیر پاک وہند اور بنگلہ دیش کے ہزاروں مدارس وجامعات میں تعلیمی سال کا اختتام شعبان المعظم پر جبکہ یورپین، عرب اور بعض دیگر ایشیائی ممالک میں مختلف مہینوں میں تعلیمی سال کا اختتام ہوتا ہے۔ان جامعات ومدارس سے ہر سال ہزاروں طلباء اپنا تعلیمی دورانیہ پورا کر کے سندِ فراغت حاصل کرتے ہیں۔اکابر ومشائخ، علماء صلحاء ان کے سروں پر عمامہ بندی کر کے ان پر اظہارِ اعتماد کرتے ہیں۔حقیقت میں ان فضلاء کے اساتذہ کرام علومِ نبوت کی وہ وراثت وامانت جو اُنہوں نے اپنے اپنے مشائخ واساتذہ سے حاصل کی تھی اور اس ''بارامانت'' کو اگلی نسل تک پہنچانے کا جو عہد و پیمان اپنے رب اور اپنے اساتذہ ومشائخ عظام سے کیا تھا، اُس عہد و پیمان کا ایفاء کر کے اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو رہے ہوتے ہیں اور اُن کے نوخیز فضلاء وتلامذہ اس ''بارامانت'' کو اپنے اپنے کندھوں پر لادے اپنے اکابر کا عہد و پیمان اپنے ذمہ لے کر عملی میدان میں اُترے جا رہے ہیں۔اس موقع پر اِنہیں احساس ذمہ داری دلانا اور ان کی راہنمائی کرنا، اُن کا حق اور اَساتذہ کا فرض ہوتا ہے، اس لیے تعلیم کے آخری ایام میں بیشتر مدارس وجامعات میں فضلاء کے لئے خصوصی تقاریب کا انعقاد ہوتا ہے اور بعض حضرات تحریری طور پر فضلاء کرام کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔اس سلسلہ میں چند گذارشات پیشِ خدمت ہیں:

جامعات ومدارس کے فضلاء کو اجازتِ حدیث، سندِ فراغ یا اُن کے مبارک سروں پر عمامہ بندی، اُن پر اہلِ علم اور اساتذہ کرام کے اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔یہ اعتماد اِس بنیاد پر ہوتا ہے کہ فراغت کے بعد سند یافتہ فاضل اپنا تعلق علم وعمل سے اِستوار رکھ کر علمی وعملی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا رہے گا۔نیز وہ برابر محنت وکاوش کرتے ہوئے علمی ودینی مشاغل کو جاری رکھتے ہوئے اپنی علمی استعداد کو مضبوط کرے گا۔ظاہر ہے کہ مشاغلِ علمیہ کے ساتھ روز بروز علمی ترقی نصیب ہوتی ہے اور مذکورہ فاضل اپنے مشائخ کے اعتماد پر پورا اُترتے ہوئے اپنا اور اپنے مشائخ کا نام بلند کرتا ہے۔لیکن اگر مذکورہ فاضل علمی مشغلہ ترک کر دے اور علمی وروحانی سلسلہ سے نکل جائے تو نہ ہی ایسے شخص کی علمی شناخت باقی رہتی ہے اور نہ ہی سندِ فراغ کا وَقار یا اساتذہ ومشائخ کا اعتماد باقی رہتا ہے۔ایسے شخص پر نہ تو مشائخ اعتماد کرتے ہیں اور نہ ہی عوام الناس کا اعتماد برقرار رہتا ہے۔اس لئے اکابر ومشائخ کے اعتماد کو برقرار رکھنے کے لئے درج ذیل

اَمور کی فضلاء کو رعایت رکھنا از حد ضروری ہے:

(۱).....اپنے اوقات کو کلی طور پر اشاعتِ دین، خدمتِ علم میں صرف کرے خواہ اس کی مشکل تدریس کتبِ دینیہ کی ہو یا تدریسِ قرآن کریم، اِمامت وخطابت کی ہو یا تبلیغ وتقریر کی، تصنیف وتالیف کی ہو یا اصلاح وسلوک کی۔ اگر کلی اوقات اِن مقاصد میں صرف کرنا ممکن نہ ہو تو اپنے اوقات کا جزوی حصہ اِن مقاصد میں استعمال کرے، یہ علم کی زکوٰۃ بھی ہے اور قرضِ علم کی ادائیگی بھی۔ اس سے نہ صرف علم میں اضافہ ہوگا بلکہ حاصل شدہ علم بھی محفوظ ومضبوط ہوگا۔ اپنے مشائخ سے سنا ہے کہ تدریس وتبلیغ گناہوں سے مانع ہوتی ہے اور اِن اعمال کے ساتھ تو جناب انبیاء علیہم السلام اور مقربینِ خدا سے نسبت قائم ہو جاتی ہے۔ نیز آخرت میں نیک نامی اور صدقہ جاری کا سامان نصیب ہوتا ہے اور دنیا میں وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ کا مصداق بھی عطا ہوتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اگر دینی وعلمی مشغلہ نہ اختیار کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ مدارس کی ۱۶ سالہ محنت کا ضیاع ہو جاتا ہے بلکہ ''ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد'' کا مصداق بن کر گرد وپیش کے ماحول میں تحلیل ہو کر اپنی علمی ودینی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ حقیقت میں فضلاء نے اپنے مشائخ سے جو علمی میراث حاصل کی، اُسے اگلی نسل تک پہنچانا اِن کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری پر کوتاہی روزِ محشر باز پرس کا ذریعہ ہوگی۔

(۲).....اپنی اصلاح وروحانی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ کسی متبعِ سنت شیخ سے اصلاحی تعلق قائم کر کے باقاعدہ اُن کی صحبت اختیار کی جائے۔ صحبت کی برکت سے اخلاص وللّٰہیت، ادب واحترام، تواضع وانکساری، خدمت وتعاون، ایثار وقربانی جیسے فضائل اور ریاء، عُجب، حسد، بغض، کینہ، تکبر، بدنظری، بدکارکرداری، حُبِ دنیا، خودغرضی جیسی رذائل سے اجتناب ہو جاتا ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ارشاد گرامی ہے:

''ہم نے ایک بھی ایسی شخصیت نہیں دیکھی، جو مدرسوں میں پڑھی ہو اور بدونِ صحبت اُسے صفات حاصل ہوئی ہوں۔ اِس کے برعکس ایسی بہت سی شخصیات پیش کی جاسکتی ہیں، جنہوں نے مدرسہ کا منہ تک نہیں دیکھا لیکن صحبتِ اولیاء وصلحاء کی برکت سے علم سے مالا مال ہوئے۔'' (ملخص)

فراغتِ علم پر ایک گونہ کبر پیدا ہو جاتا ہے، جو بہت سے فضلاء کی محرومی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کبر وعجب کا علاج سوائے صحبتِ صالحین وتربیتِ مشائخ کے کوئی نہیں۔ فضلاءِ کرام خانقاہی نظام میں منسلک ہو کر اپنے علم میں عمل وتقویٰ کے ذریعے کمال پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمارے اکابر میں ایک شخصیت بھی ایسی نہیں، جو کسی نہ کسی شیخِ کامل سے اجازت یافتہ نہ ہو۔ ایک زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کا چوکیدار اور خاکروب بھی صاحبِ نسبت ہوا کرتا تھا۔ اَخیر شب میں دارالعلوم کے درودیوار ذکرِ الٰہی اور گریہ زَاری سے گونج اُٹھتے تھے۔ ذکرِ الٰہی نہ صرف برکات ورحمتوں کا ذریعہ

ہوتا ہے بلکہ اِس کی برکت سے فتنے بھی مسدود رہتے ہیں۔ ہر فاضل کو اپنے اپنے سلسلہ کے قواعد وضوابط کے مطابق ذکر الٰہی کا التزام اور صلوٰۃ التہجد، نماز باجماعت، سنن ونوافل کا اہتمام کرنا چاہئے۔ دورِ حاضر میں اصلاح کا یہ مقصد تبلیغی جماعت میں وقت لگا کر اور مسلسل جڑنے کے ساتھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ بیعتِ سلسلہء تصوف مقصودِ اصلی نہیں مقصدِ اصلی تو ''اصلاحِ نفس اور تزکیہ'' ہے، تصوف وسلوک اس کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ مقصد بغیر سلوک کے حاصل ہو جائے تو مقصد حاصل شد۔

(۳).....عصر حاضر کے مقتدر علماء کرام، مشائخِ عظام اور اساتذہء کرام سے رابطہ، اِعتماد علی السلف والاکابر، ایمان، مسلک، اعمال اور اقدار کی حفاظت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ دنیا اور وطن کے بدلتے ہوئے سیاسی، مذہبی، معاشی، معاشرتی حالات میں ایک عام شخص کے لئے حق وباطل، سچ وجھوٹ کا امتیاز ایک مشکل اَمر ہوتا ہے۔ خاص طور پر میڈیا کے ذریعے اور حکومتی وبین الاقوامی وسائل کے زور پر ملمع سازی کا جو طوفان اُٹھا ہے، اس میں سیاہ کو سفید اور رات کو دن ظاہر کرنے کا دجالی فن عروج پر ہے۔ ان حالات میں اپنے مکتبہ فکر کے عظیم بزرگوں کی طرف رجوع اور اِن سے راہنمائی کا حصول ضروری ہے، اِن اکابر کی پالیسی کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیا جائے۔ ہمارے شیخ حضرت لدھیانویؒ کا اِس سلسلہ میں مزاج یہ تھا کہ آپ دیگر ملکی شخصیات سے مل کر لائحہ عمل اختیار فرماتے، اِجتماعیت کو پسند فرماتے اور شذوذ وتنہائی کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ اہل علم، مدارس وجامعات سے رابطہ کی ایک صورت یہ بھی کہ اِن اداروں سے نکلنے والے ماہ نامہ جرائد کا مطالعہ باقاعدگی کے ساتھ کیا جائے۔ اس اہل حق کے چند جرائد کے نام پیشِ خدمت ہیں:

(۱)۔ ماہ نامہ بینات کراچی	(۲)۔ ماہ نامہ البلاغ کراچی
(۳)۔ ماہ نامہ الفاروق کراچی	(۴)۔ ماہ نامہ الحق اکوڑہ خٹک
(۵)۔ ماہ نامہ الخیر ملتان	(۶)۔ ماہ نامہ الحسن لاہور
(۷)۔ ماہ نامہ انوارِ مدینہ لاہور	(۸)۔ ماہ نامہ لولاک ملتان
(۹)۔ ماہ نامہ الجمعیۃ	(۱۰)۔ ماہ نامہ نقیبِ ختم نبوت
(۱۱)۔ ماہ نامہ تذکرہ دارالعلوم کبیر والا	(۱۳) ماہ نامہ القاسم نوشہرہ
(۱۲)۔ ماہ نامہ صدائے فاروقیہ شجاع آباد	(۱۴) روزنامہ اسلام

علاوہ ازیں مرکزی جامعات کے جرائد ورسائل کا مطالعہ نہایت فائدہ مند ثابت ہوگا۔

(۴).....عصر حاضر میں علماء اور عوام میں بُعد پیدا کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے آزمائے جا رہے ہیں۔

اس لئے کہ گمراہی اور من پسند نظریات کا پھیلاؤ علماء سے اعتماد کے خاتمہ کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ فضلاء کا عوامی رابطہ مضبوط ہونا چاہئے۔ عوام سے رابطہ کے لئے مساجد میں ناظرہ قرآن کریم کے مکاتب کا قیام، دروس القرآن ودروس الحدیث کے سلسلے، جمعہ کے موقع پر مختصر لیکن مؤثر بیان جس میں وقت کی پابندی کے ساتھ نہایت مدلل، آسان اور عوامی انداز کا ہونا ضروری ہے۔ بیانات میں موضوعات اور انداز کے حوالہ سے احقر کا تفصیلی مضمون ''فضلاء مدارس وجامعات کی خدمت میں چند ضروری گزارشات'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، یہ مضمون کئی قسطوں میں گزشتہ سال ماہ نامہ صدائے فاروقیہ میں شائع ہوتا رہا۔ مضمون میں مدرسین قرآن، درجہ کتب، ائمہ وخطباء کے لئے الگ الگ ہدایات موجود ہیں۔

(۵).....موجودہ ملکی حالات کے تناظر میں قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنا دفاع اور اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوشی ضروری ہے۔ ملکی آئین وقوانین کی پاسداری کرتے ہوئے محتاط انداز میں خدمتِ دین کا فریضہ سرانجام دیا جائے، نہ تو مایوس ہو کر خدمتِ دین ترک ہو اور نہ ہی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا جائے، اس میں حکمت وبصیرت پیشِ نظر رہے۔ فضلاء کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں موجودہ ملکی قوانین سے آگاہی، شہری حقوق، آئین کے تحت حاصل ہونے والی آزادیوں کا جاننا ضروری ہے۔

(۶).....فضلاء کو سکولوں اور قومی اداروں کی طرف توجہ دینا بھی حالات اور وقت کا تقاضا ہے۔ ظاہر ہے کہ مدارس میں پڑھنے والے طلباء تو کل آبادی کا بالکل معمولی حصہ ہیں، زیادہ تر بچے تو عصری تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ انہیں ایک اچھا مسلمان بنانا اور محبِ وطن شہری بنانا بھی اُن کا حق اور ہمارا فرض ہے۔ اس لئے علماء کرام اپنی نگرانی میں ایسے عصری تعلیمی ادارے قائم کریں، جہاں اعلیٰ عصری تعلیم نہایت اعلیٰ معیار پر دی جائے اور ساتھ دینی تربیت اسلامی ثقافت وتہذیب کا احیاء وتنفیذ کا اہتمام ہو، یہ سلسلہ فضلاء کے رزقِ حلال کے ساتھ خدمتِ دین کا بھی ذریعہ ہوگا۔ اگر ادارہ قائم کرنا مشکل ہو تو پہلے سے موجود اداروں کو اپنی سرپرستی میں لے کر بھی کام کیا جا سکتا ہے۔ ان اداروں کے سربراہوں کو ترغیب دے کر اُنہیں اپنا تعاون پیش فرمائیں۔ اس سلسلہ میں جو ادارے دینی طرز پر کام کر رہے ہیں، ان سے مزید راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

(۷).....بین الاقوامی طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جاری منظّم اور ہمہ جہت جنگ کے اثرات اسلامی ممالک کے حکمرانوں اور عوام پر نمایاں ہو رہے ہیں۔ اس تناظر میں اَحکامِ اسلامی کے خلاف پروپیگنڈہ، اسلام پر اِلزام تراشی، اِستہزاء اور اعتراضات کا سلسلہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ لبرل اور سیکولر طبقے کی جانب سے کھلے عام شعائرِ اسلام کی توہین وتنقیص، اِسلام کے مسلّمہ احکام اور مقدس شخصیات پر بہتان طرازی، تضحیک، توہین کا سلسلہ

جاری وساری ہے۔

(۸).....احکام اسلام پر اعتراضات وغیرہ فضلاء اور علماء کے لئے بڑا چیلنج بن کر سامنے آرہا ہے۔اس سلسلہ پر اشتعال انگیزی اور جذبات کا بھڑکنا اور مشتعل ہونا فطری اَمر ہے۔لیکن بسا اوقات مسلمانوں کا ردّعمل نسلِ نو کے نوجوانوں کو تشفی وتسلی نہ ہونے کی وجہ سے مذہب سے دور کر دینے کا سبب بن جاتا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے عقلی ونقلی انداز سے مثبت وسنجیدہ دلائل کے ساتھ ان لوگوں کی تردید کی جائے،ایسے لوگوں کے خلاف صدائے اِحتجاج بلند کرنے کی اہمیت سے بھی کوئی انکار نہیں،تاہم ان کا علمی محاسبہ ضروری ہے۔اس لئے پہلے فضلاء کو خصوصی طور پر تیار کرنا اور اپنے آپ کو علمی طور پر مسلح کرنا ضروری ہے۔دورحاضر کے چیلنج کو سمجھنے کے لئے اور اُن سے نبرد آزما ہونے کے لئے اِس موضوع پر کام کرنے والے علماء کرام سے استفادہ کیا جائے۔ان موضوعات پر اکابر کی تصنیفات،اور مضامین کا بغور مطالعہ کیا جائے اور نسل نو کے ایمان کی حفاظت کی جائے۔

(۹).....مغرب کی اِسلام دشمن پالیسیوں سے متأثر حکمرانوں کی اِسلامی ممالک پر مذہبی طبقات کے خلاف اِمتیازی قوانین اور پالیسیوں کو جاری رہتی ہیں۔اس لئے فضلاء کرام کو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے نہایت حکمت وبصیرت کے ساتھ خدمت دین سرانجام دینے کی ضرورت ہے۔ہمارے اکابر کا واسطہ انگریز جیسے ظالم وجابر سے رہا،اُنہوں نے حکمت کے ساتھ اپنے مشن کو جاری رکھا،نہ تو خدمت دین کو ترک فرمایا اور نہ ہی اپنے آپ کو بلاوجہ مشقت وہلاکت میں ڈالا۔دورِحاضر کے علماء وفضلاء کو اِس طرف خصوصی دھیان رکھنا ہوگا،تاکہ خدمتِ دین اور قوم کی راہنمائی کے فریضہ کو اَحسن انداز میں سرانجام دیا جاسکے۔

(۱۰).....فضلاء کرام میدانِ عمل میں اُترنے کے بعد اِس بات کا اہتمام کریں کہ لوگوں کے نجی کاروباری اور ذاتی قسم کے معاملات سے حتی الامکان اپنے آپ کو دور رکھیں،ورنہ بعض اوقات علم اور علماء کی بدنامی کے ساتھ علماء سے تنفر اور بداعتمادی کا سبب بنتا ہے۔ہمارے بعض فضلاء معاشی ترقی کے لالچ میں بعض کمپنیوں یا تاجروں کے ہاتھوں استعمال ہوکر اپنے حلقہ اثر کے لوگوں کو ان کی کمپنیوں میں انویسٹمنٹ کی ترغیب دیتے ہیں،جس پر لوگ مذہبی شخصیت پر اعتماد کی وجہ سے اپنا پیسہ ان کمپنیوں میں جھونک دیتے ہیں۔کاروبار میں خسارے یا غیر شرعی طرز اَپنانے کی وجہ سے مذکورہ شخصیت سے تنفر کے ساتھ بسا اوقات قانونی گرفت کی افتاد بھی آن پڑتی ہے۔بعض فضلاء دوسروں کو اپنی جمع پونجی کاروبار کے لئے دے کر ہمیشہ کے لئے سرمایہ سے محروم ہوجاتے ہیں۔اسی نوعیت کے مختلف انداز اختیار کئے جارہے ہیں،مثلاً؛ویزوں کی فروختگی،عازمینِ حج وعمرہ کو کمیشن پر پیکیج دلانا،جائیدادوں کی خرید وفروخت وغیرہ یہ تمام سلسلے دینی ودنیوی نفرتوں کا ذریعہ ہیں۔اگر فضلاء کو کاروبار کرنا بھی ہو تو ماہرینِ تجارت وماہرینِ شریعت کی

مشاورت سے شرعی تقاضوں اور اپنے منصب کو پیشِ نظر رکھ کر کاروبار کیا جائے تو مفید ہوگا۔ ہر وہ کام جو لالچ، سستی شہرت اور دیگر دنیوی اعراض کی بنیاد پر کئے جائیں وہ ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔

(۱۱).....معاشرہ میں اپنے آپ کو منوانے، اپنا اَثر ظاہر کرنے اور علماء سے متنفر طبقات کو قریب لانے کے لئے اخلاقِ عالیہ سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں۔ اپنے آپ کو اعلیٰ اخلاق سے متصف کرنا، لوگوں سے میل جول رکھنا، کڑوی کسیلی باتوں کو سن کر دَرگذر کرنا، صلہ رحمی اور معاف کر دینے کی مہارت انسان کو نہایت بلند بنا دیتی ہے۔

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیازی وصف ''حسنِ اخلاق'' ہی تھا، آپ نے سارے جہان کو حسنِ اخلاق سے فتح فرمایا۔ قرآن وسنت میں آپ کے عالی اخلاق کے تذکرے اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ آپ کے صبر و برداشت، تحمل ووقار کی احادیث بھی آپ فضلاء کے سامنے ہیں، اِنہی اعلیٰ اوصاف کے ساتھ ہی ایک داعی اور دین کے خدمت گار کو قبولیت وعزت نصیب ہوتی ہے۔

بعض فضلاء کرام جوانی کے زعم میں اپنے رشتہ داروں بلکہ اہل محلّہ برادری، مسجد ومدرسہ کی انتظامیہ، طلباء کے والدین اور نمازیوں تک سے بات بات پر اُلجھ کر اپنے آپ کو متنازعہ اور فریق بنا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ ''متنازعہ'' بن کر رہ جاتے ہیں لوگ ان سے استفادہ نہیں کرتے، یوں ان کی صلاحیتیں ضائع ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اپنے آپ کو قیمتی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر قسم کے تنازعات سے اپنے آپ کو بچایا جائے اور اخلاق ومحبت کا دامن نہ چھوڑا جائے۔ إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الإِصْلَاحَ، وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ۔☆☆

مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کی ایک اہم نصیحت

مجھے یاد آتی ہے وہ بات جب میں اپنی رسمی طالب علمانہ زندگی کو مکمل کر کے مدینہ منورہ سے واپس آیا اور میرے بزرگوں نے مختلف کام سپرد کیے تو پہلے ہی دن میرے والد ماجد نے مجھے بٹھایا اور کہا:.....اب تم زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہو، میں تجربوں کی روشنی میں کچھ باتیں تم کو سمجھانا چاہتا ہوں، دل کے کانوں سے سننا اور دل پر نقش کر لینا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا، کیونکہ وہ اس طرح تمہید باندھ کر گفتگو کرنے کے عادی نہیں تھے، وہ سیدھے سیدھے کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ ٹھیک ہے وہ غلط ہے، لیکن اس طرح کی گفتگو وہ بہت کم کرتے تھے، میں سناٹے میں آ گیا کہ اب میرے والد مجھے کیا کہنے جا رہے ہیں۔ پھر انہوں نے کہا:..... ''اچھی طرح سمجھ لو کہ تم اس قوم کی تربیت وخدمت کے لیے میدان میں اتر رہے ہو جس کی طرف سے تمہیں سوائے تنقیدوں اور ہمت شکنیوں کے کچھ نہیں ملنے والا ہے، یہ قوم تم کو خون کے آنسو رلائے گی، تم اس قوم کی خاطر اپنے بچوں کو جھونک دو گے، اپنی صحت وجان کو خطرے میں ڈال دو گے، سب کچھ لٹا دو گے، تب بھی یہ قوم تمہیں بخشے گی نہیں، اس لیے پہلے دن سے اپنی نیت کو خالص کر لو! صرف اللہ کی طرف دیکھنا قوم کی طرف مت دیکھنا! بالکل مت دیکھنا! اگر تم نے آخرت اور مغفرت کی نیت کر کے کام کیا تب تو تم کام کے میدان میں جمے رہو گے، ورنہ کچھ دن بعد بھاگ کھڑے ہو گے۔''.....ان کی بروقت نصیحت اور آج تک کام آ رہی ہے۔ (مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی دامت برکاتہم)

حافظ خلف بن سالم رحمۃ اللہ علیہ

قرون اولیٰ کے ایک جلیل القدر سندھی محدث

جناب حافظ محمد اسماعیل

قرون اولیٰ کے سندھی محدثین اور علماء میں سے کئی ایسی اونچی شخصیتیں ہیں جن سے آج سندھ کا کوئی شخص واقف نہیں۔ سندھی علماء کے تذکروں میں ان کے حالات تو کجا ان کے نام بھی نظر نہیں آتے۔ آیئے آج تیسری صدی کے ایک نامور محدث خلف بن سالم کی سوانح وتعارف کا اجمالی تذکرہ رجال واسانید کے دفتر سے معلوم کریں۔

آپ کی کنیت ابومحمد اور نام خلف بن سالم تھا، آل المہلب کے ساتھ ولاء کا تعلق تھا اس لئے آپ کو مولی آل المہلب اور مہلبی بھی کہا جاتا تھا۔ آپ سندھ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں زندگی گزاری۔

مولیٰ کا لفظ جیسا کہ علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللغات کے مقدمہ میں تصریح کی ہے اگرچہ زیادہ تر حلیف اور مولی الموالاۃ کے معنی میں مستعمل ہے تاہم چونکہ مولی آزاد کردہ غلام کو بھی کہتے ہیں اس لئے لفظی مشارکت کی بناء پر بعض وقت دھوکہ ہو جاتا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی بعض لوگوں کو یہی مغالطہ ہوا ہے کہ وہ مولیٰ کے معنی غلام کے سمجھے لیکن خود امام اعظم کی تصریح اس کے برخلاف موجود ہے۔ جیسا کہ امام طحاوی کی کتاب شکل الآثار کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

ابوعبدالرحمٰن المقری نے کہا کہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا تو وہ مجھ سے دریافت کرنے لگے تم کون ہو؟، میں نے عرض کیا ایک ایسا شخص کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ احسان فرمایا ہے (یعنی نومسلم) امام صاحب نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ ان قبائل میں سے کسی سے موالات کو لو پھر تمہارا بھی انتساب انہیں کی طرف ہونے لگے گا کیوں کہ خود میں بھی ایسا ہی تھا۔ خلف بن سالم کو مولیٰ آل المہلب بھی غالباً اسی نسبت سے کہا جاتا ہے۔

آپ بہت بڑے حفاظ حدیث میں سے تھے چنانچہ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں آپ کے تذکرہ میں لکھا ہے:.....الحافظ الکبیر یعنی بڑے حافظ!۔ آپ سندھی تھے لیکن تذکروں سے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ آیا ان کے والد مسلمان ہوئے تھے یا دادا؟!۔

آپ کے اساتذہ میں بڑے نامور محدثین شامل ہیں۔ جیسے یحییٰ بن سعید القطان المتوفی ۱۹۸ھ عبدالرحمٰن بن

مہدی (المتوفی ۱۹۸ھ)،عبدالرزاق بن ہمام (المتوفی ۲۱۱ھ)،ھشیم بن بشیر (المتوفی ۱۸۸ھ)،ابن ادریس عبداللہ بن ادریس الکوفی (المتوفی ۱۹۲ھ)،معن بن عیسیٰ القزاز (المتوفی ۲۱۹ھ)،ابوبکر بن عیاش (المتوفی ۱۷۳ھ)،محمد بن جعفر غندر (المتوفی ۱۹۳ھ)،ابونعیم الفضل بن وکین (المتوفی ۲۱۹ھ)۔یزید بن ہارون (المتوفی ۲۰۶ھ)،وھب بن جریر البصری (المتوفی ۲۰۶ھ)،محمد بن عبداللہ ابن نمیر (المتوفی ۲۳۴ھ)،ابو احمد الزبیری محمد بن عبداللہ الاسدی الکوفی (المتوفی ۲۰۳ھ)،سعد بن ابراہیم بن سعد (المتوفی ۲۰۱ھ)،یعقوب بن ابراہیم بن سعد الزھری (المتوفی ۲۰۸ھ) اوران کے علاوہ بے شمار اساتذہ تھے۔

آپ کے شاگردوں میں مندرجہ ذیل محدثین قابل ذکر ہیں:

احمد بن ابی خیثمہ (المتوفی ۲۱۹ھ) ابوحاتم الرازی محمد ادریس الحنظلی (المتوفی سہ) (یہ بخاری کے استاد ہیں) ابو زرعہ عبدالرحمٰن بن عمرو الدمشقی (المتوفی ۲۸۱ھ) (محدث شام) یعقوب بن شیبہ (المتوفی ۲۶۲ھ)، یحییٰ بن عبدک القزوینی (المتوفی سہ) عثمان بن سعد الدارمی (المتوفی ۲۸۰ھ) یعقوب بن یوسف المطوعی (المتوفی سہ) عباس بن محمد الدوری، (المتوفی ۲۷۱ھ) اسماعیل بن ابی الحارث اسد بن شاھین (المتوفی ۲۵۸ھ) حاتم بن اللیث (المتوفی سہ) جعفر بن محمد الطیالسی (المتوفی ۲۸۲ھ) الحسن بن علی العمری (المتوفی ۲۹۵ھ) ابوالقاسم عبداللہ بن محمد البغوی (المتوفی ۳۱۰ھ) احمد بن علی الابار (المتوفی ۲۹۰ھ)،ابوبکر احمد بن علی بن سعد المروزی (المتوفی ۲۹۳ھ) احمد بن الحسن الصوفی (المتوفی سہ)

امام ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی (صاحب السنن) فرماتے ہیں کہ میں نے خلف بن سالم سے پانچ احادیث سنیں جنہیں میں احمد بن حنبل سے سن چکا تھا۔

امام نسائی آپ سے ایک شخص کے واسطے سے روایت کرتے ہیں:

علی بن سہل البزار فرماتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے سنا وہ فرماتے تھے کہ خلف بن سالم بلاشبہ سچے ہیں۔

ہر زمانے میں بعض لوگ بڑے محدثین پر جھوٹے الزام لگایا کرتے ہیں تاکہ ان کو کسی طرح کمزور کر دیا جائے۔ خلف بن سالم پر بھی اس قسم کے الزامات لگائے گئے لیکن امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن معین نے ان الزامات کو بالکل بے بنیار قرار دیا ہے۔جیسا کہ مندرجہ ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے:

ابوبکر الخطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اور حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ عبدالخالق بن منصور فرماتے ہیں میں نے یحییٰ بن معین سے پوچھا کہ خلف بن سالم المخرمی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے فرمایا صدوق (یعنی سچے ہیں) تو میں نے کہا کہ اے ابوزکریا (یہ یحییٰ بن معین کی کنیت ہے) وہ اصحاب

رسولؐ کے عیوب ونقائص کے بارے میں احادیث بیان کرتا ہے تو یحییٰ بن معین نے فرمایا کہ وہ ان احادیث کو جمع تو کرتا تھا لیکن بیان نہیں کرتا۔

آپ غالباً ان احادیث سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے جمع کرتے ہوں گے جیسے کہ حفاظ حدیث کو لاکھوں موضوع احادیث یاد تھیں۔اب ان کے بارے میں کہا جائے چونکہ وہ جھوٹی احادیث جمع کرتے اور یاد کرتے تھے اس لئے وہ ضعیف اور نا قابل اعتبار تھے تو یہ کس طرح صحیح ہوگا؟

امام احمد مزید فرماتے ہیں کہ میں خلف بن سالم کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ نہایت ہی ایمان دار اور صاحب عفت ہیں۔امام نسائی اور ابو حاتم الرازی فرماتے ہیں خلف بن سالم قابل اعتماد ہیں۔

حمزہ الکنانی اور ابن حبان نے انہیں شریف اور سمجھدار محدثین میں سے شمار کیا ہے۔آپ کے شاگرد مشہور محدث یعقوب بن شیبہ فرماتے ہیں۔آپ قابل اعتماد اور معتبر تھے نیز انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ محدث حمیدی (استاذ البخاری) اور مسدد دونوں سے زیادہ قابل اعتماد تھے حافظ ذہبی، ابن خیثمہ، امام بخاری، ابن سعد، اور خطیب بغدادی متفق ہیں کہ آپ کی وفات بغداد میں ۲۳۱ھ میں ہوئی تھی، اتوار کا دن تھا اور رمضان المبارک کی ۲۳ تاریخ تھی، اور آپ کی عمر ۶۹ سال تھی۔

ابو غالب علی بن احمد بن النضر کہتے ہیں کہ آپ کی وفات ۲۳۲ھ میں ہوئی اور ابو حسان الزیادی کہتے ہیں کہ اس وقت آپ کی عمر ۷۰ سال تھی لیکن آپ کی وفات اور عمر کے بارے میں پہلا قول راجح ہے جس پر اکثر مؤرخین کا اتفاق ہے۔

ابن سعد، الطبقات الکبیر، میں کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک مسند تصنیف کیا تھا جس میں احادیث رسولؐ جمع کی تھیں۔لیکن تا حال اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

حوالہ کے لیے دیکھیے:

(۱) میزان الاعتدال للامام الذھبی، ج۱ص۳۱۰۔(۲) تذکرۃ الحفاظ للامام الذہبی ج۲ص۶۵

(۳) تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ص۳۲۸۔۳۳۰ ج۸۔(۴) تہذیب التہذیب لابن حجر ج۳ص۱۵۲

(۵) الطبقات الکبیر لابن سعد ج۷قسم۲ص۹۲ طبع لیدن۔(۶) کتاب الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج۱قسم۲ ص۱۷۳۔(۷) التاریخ الکبیر للامام البخاری ج۲قسم۱ص۱۷۹۔

ایک بے مثال استاذ، ایک باکمال فقیہ

مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد ناظم اشرف عثمانی

کبھی کبھی ہماری بے بسی ہمیں ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں سے واپسی کسی بھی صورت میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتی۔ ایسے ہی موڑ کا سامنا مجھے اس وقت کرنا پڑا جب میرے محبوب ترین بے مثال استاذ، میرے ماموں زاد بھائی اور میرے مشفق ومہربان سسر حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی رح اپنی زندگی کی تقریباً ستّر بہاریں دیکھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انکی محبتیں، شفقتیں، مہربانیاں اور احسانات بیان کرنے کے لیے نہ میرے پاس الفاظ ہیں اور نہ اظہار کی ہمت، یہ وہ مقام ہے جہاں جذبات کی فراوانی الفاظ کی کمی کی شکایت کرتی نظر آتی ہے، جبکہ اظہار سے عاجزی بیتابی کے سیلاب میں مزید اضافے کا باعث ہوتی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی رح مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے صاحبزادے جناب مولانا نازکی کیفیؒ کے سب سے بڑے فرزند تھے، جبکہ حضرت مولانا محمد ولی رازی مدظلہم، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہم اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کے بھتیجے تھے۔

آپ نے ملک کی دو عظیم درسگاہوں جامعہ اشرفیہ لاہور اور جامعہ دارالعلوم کراچی میں طویل عرصے تک تدریسی ذمہ داریاں انجام دیں، جس کا دورانیہ نصف صدی سے کچھ زائد بنتا ہے۔ اس دوران ان سے استفادہ کرنے والے بلاواسطہ ہزاروں اور بالواسطہ لاکھوں شاگرد ملک کے طول وعرض اور بیرون ملک کے مختلف ممالک میں دین اسلام کی خدمت میں مصروف عمل ہیں اور آپ کے لیے صدقہ جاریہ کا باعث ہیں۔

شہرت، ناموری اور نمایاں ہونے سے کوسوں دور رہ کر اخلاص وللّٰہیت سے دین کی خدمت کرنا حضرت کا وصف خاص تھا۔ جلسے، جلوس، تقریریں اور اسفار کی بجائے خالصتاً افتاء وتدریس کو ترجیح دینا اور یکسو ہو کر ان میں اپنی محنت اور توانائیاں صرف کرنا ان کے نزدیک زیادہ فائدے مند سودا تھا، چنانچہ یہ سودا وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے، اسی لیے افتاء وتدریس کے دونوں میدانوں میں وہ ایسے شہسوار نظر آتے تھے جن کی مثالیں زمانے میں کم ملتی ہیں۔

علم وعمل پر جب حسن اخلاق کا زیور چڑھ جائے تو وہ نور علی نور بنکر شخصیت کو ممتاز کر دیتا ہے۔ حضرت مفتی محمود اشرف عثمانیؒ کو اللہ تعالی نے حسن اخلاق سے خوب خوب نوازا تھا، حضرت سے تعلق رکھنے والے حضرات بخوبی

واقف ہیں کہ فتویٰ یا کسی مسئلے کے سلسلے میں حضرت سے رابطہ کرنا اور مسئلے کا حل تلاش کرنا جتنا آسان تھا عموماً اتنی آسانی اور جگہوں پر کم میسر ہوتی ہے، وقت بے وقت لوگوں کے مسائل سننا اور پھر بغیر تیوری چڑھائے جلد از جلد انہیں حسن اخلاق سے تسلی بخش جواب دیکر مطمئن کر دینا مفتی صاحبؒ کا طرہ امتیاز تھا، جس میں ظاہر ہے کہ صبر، بردباری، تحمل اور برداشت جیسے اعلیٰ اخلاق سے متصف ہونا ناگزیر ہے۔

آپ کے دروس، مواعظ اور بیانات کی شان ہی نرالی تھی، مشکل سے مشکل موضوع اور پیچیدہ ترین مباحث نرم گفتاری اور شیریں بیانی سے پانی ہوتی چلی جاتی تھیں، خشک اور سنگلاخ چٹانوں جیسے مسائل میں دور جدید کی نئی مثالیں مضمون میں چاشنی پیدا کر دیتی تھیں، ٹھہر ٹھہر کر گفتگو زبان کی سلاست کو چار چاند لگا دیتی تھی، منفرد لب ولہجہ جب تفہیم کے ملکہ سے مزین ہوتا تو سننے والا متاثر ہوے بغیر نہ رہ پاتا۔

مفتی صاحب رح سے شرف تلمذ حاصل کرنے والے حضرات پر یہ ہرگز مخفی نہیں ہے کہ ان کے مزاج میں نہایت اعتدال تھا، گفتگو ہو یا تحریر اعتدال کے دامن سے لبریز ہوتی، اپنے طلباء اور متعلقین کو وقتاً فوقتاً اعتدال کی تعلیم دیتے اور انہیں اس کی اہمیت اور فوائد سے روشناس کراتے، فرماتے دین ہو یا دنیا اعتدال دونوں میں ضروری ہے۔

مفتی محمود اشرف عثمانیؒ ان خوش نصیب اساتذہ میں سے ایک تھے جن کے ناصحانہ جملے اور ملفوظات اہل علم، اساتذہ اور طلباء کے حلقوں میں گردش کرتے سنائی دیتے ہیں، تصنع اور بناوٹ سے دور آپ کے سادگی بھرے درس کے اہل علم میں چرچے ہیں۔ طلباء کی دکھتی رگ سے واقف تھے، اسی لیے آپ کی موقع بموقع نصیحتیں زخموں پر مرہم کا کام دیتی تھیں۔ ان کے درس وتدریس کی مٹھاس ان سے محبت وتعلق رکھنے والوں کے دلوں میں آج بھی باقی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ گزشتہ کئی برسوں سے دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔ مگر غیر معمولی ہمت اور حوصلے سے اپنے دینی کاموں کو بدستور جاری رکھے ہوے تھے۔ آخری کئی سالوں سے دارالعلوم کراچی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا تھا۔ ان کی زندگی کا محور درس قرآن، درس بخاری اور دارالافتاء کی وہ ذمہ داریاں تھیں جس میں انہوں نے اپنے آپ کو سمیٹ لیا تھا۔ اس چکا چوند دنیا سے انہوں نے اپنا رخ شروع ہی سے موڑ رکھا تھا۔ دنیا میں رہتے ہوے دنیا سے بے رغبتی کی نہ صرف بہترین مثال تھے بلکہ مندرجہ ذیل شعر کے بہترین مصداق بھی تھے

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

حقیقت بھی یہ ہے کہ وہ اس دنیا کے آدمی تھے ہی نہیں، انہوں نے تو دنیا کی بجائے آخرت بنانے اور سنوارنے میں اپنی انتھک محنت صرف کی تھی، اور یہ بات تو ہم نے بچپن سے سن رکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو کبھی رائیگاں

نہیں جانے دیتے۔

دوران بیماری انہیں کئی بار ہسپتال میں داخل ہونا پڑا، ہر بار مرض کی پیچیدگی کے باوجود انہیں شفاء نصیب ہوتی۔ اس بار تقریبا پچھلے ایک سال سے دل کے عارضے کے ساتھ ساتھ دیگر عوارض نے بھی گھیر رکھا تھا، پے در پے شدید امراض نے دل اور جسم دونوں کو بہت ہی کمزور کر دیا تھا، غذا بدستور کم ہو کر نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، اس کے باوجود ہمت اور حوصلہ قابل دید تھا۔

اس دوران سب گھر والوں، تینوں فرزندوں اور بے تکلف خدمتگاروں نے جس جانفشانی، محبت اور ایثار سے اپنے آپ کو خدمت کے لیے پیش کیا اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ہر طرح کے علاج و معالجے کے لیے غیر معمولی تگ و دو کرنا ان سب کے لیے بہت بڑی سعادت تھی، جس کے لیے انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی، یہ سعادت حاصل کرنے کے لیے نہ انہوں نے وقت دیکھا نہ آرام، سب کے سب ایک ٹانگ پر کھڑے جان نچھاور کرتے نظر آئے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، دل کے ساتھ ساتھ دیگر امراض میں بھی شدت آتی چلی جا رہی تھی، جس کی وجہ سے کئی بار غشی بھی طاری ہوئی، مگر اس دوران زبان پر صبر و شکر نمایاں تھے، اور کیوں نہ ہوتے؟ جس شخص کی ساری زندگی قال اللہ وقال الرسول کے مطابق صبر و شکر میں گزری ہو، اللہ تعالیٰ اسے آخری وقت میں بھی ان اعمال کی توفیق عطاء فرماتے ہیں جو اللہ تعالی کو پسند ہوں۔

بالآخر وہ دن آ ہی گیا جس کا سامنا ہم میں سے ہر شخص کو کرنا ہے۔ آخری بار ہسپتال لے جا کر علاج کی ہر ممکن کوشش کی جا چکی تھی، محبت کرنے والے ڈاکٹرز نے بھی امکانی حد تک تدبیر و علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، حضرتؒ کی خواہش کے مطابق تمام تر حفاظتی آلات سمیت حضرت کو گھر لے آیا گیا، غشی کا سفر بدستور جاری تھی، سانس بھی اپنی پہلی کیفیت بدل چکا تھا، جیسے اللہ تعالی محبت اور خدمت کرنے والوں کو کسی اچانک خبر کے لیے تیار کر رہے ہوں، انداز بتا رہا تھا کہ یہ دنیا کے غموں سے رہائی پانے کی آخری کوشش ہے۔

عصر کے بعد مغرب سے پہلے کا وقت تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی رح ایک طویل عرصے تک دنیا کی تکالیف برداشت کرتے کرتے اس دنیا سے منہ موڑ چکے تھے، عرصہ دراز سے مصائب و تکالیف کا سامنا کرنے والے چہرے پر اب ابدی سکون چھا چکا تھا، دنیا ان کے آخرت کے سفر میں حائل نہیں رہی تھی، وہ اس فانی دنیا سے آزاد ہو کر 27 فروری بروز اتوار شام 6 بج کر 10 منٹ پہ اپنے آخرت کے سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔

انتقال کی خبر ملک کے طول و عرض میں تیزی کے ساتھ پھیل چکی تھی، جنازے کا وقت رات ساڑھے گیارہ بجے

رکھا گیا تھا، اس دوران غسل، کفن اور قبر کی تیاری کے مراحل طے ہونے تھے جو بفضلہٖ تعالیٰ وقت کی رعایت کے ساتھ بڑے احسن انداز میں انجام پا گئے۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو ایک اللہ والے کے جنازے میں شریک ہونے اور کندھا دینے آیا تھا، اگرچے اگلی صبح وفاق المدارس کا پرچہ پورے پاکستان میں ہونا تھا، جس کی وجہ سے علماء طلباء اور نگران اپنے اپنے شہروں اور مراکز سے نہیں نکل سکتے تھے، پھر جنازے کا وقت بھی تقریبا آدھی رات کا رکھا گیا تھا، اسکے باوجود دارالعلوم آنے والے لوگوں کا مسلسل تانتا بندھا ہوا تھا، جو ایک مرد درویش کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے دیوانہ وار چلے آرہے تھے۔

ہم سب کے مخدوم استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ایک جم غفیر میں اپنی پرنم آنکھوں کے ساتھ نماز جنازہ پڑھائی، علماء، طلباء اور محبت کرنے والوں نے ایک متبع السنّت، باکمال مدرس، عالم باعمل، فقیہ النفس بزرگ کو آنسوؤں اور سسکیوں میں سپرد خاک کر دیا۔

اللّٰھم اغفر له وارحمه و عافه واعف عنه واکرم نزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد ونقه من الخطایا کما ینقی الثوب لابیض من الدنس وابدله دارا خیرا من داره و اهلا خیرا من اهله وزوجا خیرا من زوجه و قه فتنة القبر وعزاب النار. آمین ۔☆☆

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ادبی ذوق

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مولوی محض اور زاھد خشک نہ تھے، بلکہ شعر وسخن سے بھی علاقہ رکھتے تھے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند کو اردو کے ممتاز شعراء اور اساتذہ کا اکثر کلام یاد تھا۔ کبھی کبھی مجلس جمتی تو گھنٹوں شعر وسخن کا سلسلہ رہتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ شیخ الہند ممتاز شعراء اور سخنور اصحاب سے ملنے جلنے کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ شعر وسخن اور زبان کے فنی نکات جاننے اور ادبی موضوعات سے بہتر واقفیت اور معلومات کا شوق ان صاحبان کے پاس لے جاتا تھا، اس میں ہندو مسلم کا بھی امتیاز نہیں تھا۔

یہ واقعہ اہم اور قابل ذکر ہے کہ ایک مرتبہ غالب کے عزیز ترین شاگرد اور خاص مکتوب الیہ مرزا ہرگوپال تفتہ ایک غیر مسلم گھرانے کی تقریب میں دیوبند آئے تھے، جب شیخ الہند کو ان کے دیوبند آنے کی اطلاع ملی تو اپنی جلالت شان اور علمی رفعت ومقام کے باوجود چند اہل ذوق کو ساتھ لے کر تفتہ سے ملنے کے لیے ان کی قیام گاہ پر گئے اور وہاں دن بھر شعر وشاعری کا چرچا رہا۔ (بحوالہ "شیخ الہند کا اصل مقدمہ ترجمہ قرآن" مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی)

ذراسی احتیاط.....فوائد بے شمار

مولانا منظور احمد آفاقی

سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک دفعہ ایک گھر کو آگ لگ گئی تھی۔ آپ نے تحقیقات کرائیں۔ معلوم ہوا کہ رات کے وقت صاحب خانہ چراغ بجھائے کے بغیر سو گیا تھا۔ ایک چوہا اپنے بل سے نکلا۔ چراغ کے پاس پہنچا اور اس میں پڑے ہوئے تیل کو پینے لگا۔ تیل ختم ہوا تو اس نے بتی کا نچلا سیرا منہ میں دبایا اور چھت پر چڑھ گیا۔ بتی کا دوسرا سرا بدستور جل رہا تھا۔ چھت گھاس پھوس اور کھجور کی شاخوں کا ایک چھپر تھی، جس نے فوراً آگ پکڑ لی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے گھر میں پھیل گئی۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ان هذه النار انماهی عدو لکم، فاذا نمتم فاطفئوها عنکم"

ترجمہ: "آگ تمہاری دشمن ہے، جب سونے لگو تو اسے بجھا دیا کرو یہ پابندی صرف صرف آگ پر نہیں لگائی گئی بلکہ ہر اس چیز پر ہے جس سے نقصان کا اندیشہ ہو۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۳۱)

ایک آدمی پانی کے لیے ٹونٹی کھولتا ہے پانی نہیں نکلتا لیکن وہ کھولتا ہی چلا جاتا ہے۔ جب ٹونٹی مکمل کھل جاتی ہے اور پانی برآمد نہیں ہوتا تو وہ شخص ٹونٹی کو اسی کھلی ہوئی حالت میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے اس کے بعد جب پانی اپنے وقت پر آتا ہے تو ضائع ہوتا رہتا ہے۔ اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو زیادہ پانی نکلنے کی صورت میں کوئی نقصان بھی ہو سکتا ہے لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ جب ٹونٹی کھولی تھی اور پانی نہیں تھا تو اسے اسی وقت ہی بند کر دیا جاتا تاکہ، کوئی نقصان نہ ہو۔

ایک دوسرے شخص نے بجلی کا سوئچ آن کیا تاکہ بلب جلے یا پنکھا چلے لیکن برقی رو معطل تھی لہٰذا اس سوئچ کو اسی وقت ہی آف کر دیا جائے۔ لیکن غافل لوگ اس سوئچ کو آن ہی چھوڑ دیتے ہیں اور جب برقی رو بحال ہوتی ہے اور گھر میں کوئی نہیں ہوتا تو بلب جلتا اور پنکھا چلتا رہتا ہے۔ یعنی بجلی ضائع ہوتی رہتی ہے۔ جو قومی نقصان ہے۔

ایک تیسرے شخص نے گیس کا چولھا وغیرہ آن کیا۔ گیس نہیں نکلا تو اسے بھی وہ اسی وقت آف کر دے۔ ورنہ آن رہنے کی صورت میں گیس کے نکلنے سے جو نقصان ہوگا اس کا تصور ہی لرزا دیتا ہے۔ آپ رات کو جب سونے لگیں تو بجلی یا گیس کا ہیٹر بھی بند کر دیں۔ آن رہنے کی صورت میں کوئی حادثہ رونما ہو سکتا ہے، بلکہ اس کام میں غفلت برتنے پر کئی حادثات رونما ہو چکے ہیں۔ کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں اور گھر کے گھر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔

آپ نے گیس کے چولھے پر دودھ وغیرہ گرم کرنے کے لیے رکھا۔ جب اسے جوش آیا تو پتیلے سے نکل کر

چولھے پر گرا جس سے آگ تو بجھ گئی لیکن گیس نکلتی رہی حتی کہ پورا کچن یا کمرا گیس سے بھر گیا۔اس صورت حال میں اگر دیا سلائی جلائی جائے کو آگ بھڑک کر پورے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور ہر چیز جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ان حادثات اور نقصان پر اپنے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو یاد کیجئے۔''آگ تمہاری دشمن ہے''۔ پھر اس دشمن سے غافل مت رہیے۔

یہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے کہ ایک دن میرے کمرے میں (میری عدم موجودگی میں) ایک چور گھس آیا۔انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔وہ اس نیت سے آیا تھا کہ تنخواہ مل چکی ہے۔اچھی خاصی رقم ہاتھ آئے گی لیکن میں ابھی تنخواہ کی رقم کمرے میں نہیں لایا تھا۔اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے کمرے کی بہت سی اشیاء چرائیں اور بھاگ گیا۔میں اپنے وقت مقرر پر وہاں پہنچا تو کمرے میں افراتفری کا عالم تھا۔کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی۔رقم کی تلاش میں اس ظالم نے اس قدر ادھم مچایا کہ ایک سنورے سنبھلے کمرے کو اچھا خاصا کباڑ خانہ بنا دیا۔ کمرے کے دروازے تو بند تھے لیکن ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی حالانکہ میں اسے بھی بند کر کے گیا تھا۔میں نے اس کھڑکی کا جائزہ لیا۔اس کی ایک چٹخنی نیچے فرش پر پڑی تھی۔چور نے اسی کھڑکی پر دھینگا مشتی کی تھی،نتیجہ اس کی اندر والی چٹخنی جڑ سے اکھڑ گئی۔اس کے ساتھ ایک دوسری چٹخنی بھی تھی جسے میں نے بند نہیں کیا تھا۔اور ایک تیسری چٹخنی نیچے تھی وہ کھلی ہوئی تھی۔اس حادثے پر میری آنکھیں کہ کھڑی بنانے والے نے تین چٹخنیاں بے کار فٹ نہیں کی تھیں۔ اس نے میرا بھلا سوچا تھا لیکن مجھے اس کا احساس اس واردات کے بعد ہوا میں نے اسی دن تہیہ کر لیا کہ آئندہ کھڑکیوں اور دروازوں کی تینوں چٹخنیاں بند کروں گا تا کہ پھر کسی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔یہ صرف ارادہ ہی نہیں تھا بلکہ میں نے اس پر سختی سے عمل کرنا شروع کر دیا۔رات ہو یا دن،روشنی ہو یا تاریکی جب بھی میں کوئی دروازہ بند کرتا ہوں تو اوپر والی دونوں اور نیچے والی ایک چٹخنی ضرور بند کرتا ہوں۔میں یہ معمولی کام تقریباً آدھی صدی سے برابر کر رہا ہوں۔یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں احباب میرے اس کام کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اور میں بھی انہیں اس کے لیے مجبور نہیں کرتا لیکن اپنے بچوں کو اس کا عادی ضرور کر لیا ہے۔پہلے تو انہیں میرا یہ طریقہ پسند نہیں تھا وہ کہتے تھے کہ جب ایک چٹخنی سے کام بن جاتا ہے تو دوسری دو پر وقت کیوں ضائع کیا جائے؟ رفتہ رفتہ میں نے انہیں فائل کر لیا کہ ایک چٹخنی چور سے کھل سکتی ہے مگر تین چٹخنیاں اسے چٹخنیاں کھلائی ہیں۔صد شکر کہ انہیں میری منطق سمجھ آ گئی اور وہ بھی تین تین چٹخنیاں بند کرنے لگے ہیں۔

میرے ایک داماد اس طریقے پر خاصے چیں بہ جبیں ہوئے۔کہنے لگے محترم! آپ کھڑکیوں اور دروازوں کو تگنی کا ناچ کیوں نچواتے ہیں؟''توحید'' کا اقرار کرتے ہوئے''تثلیث'' پر عمل کس لیے کرتے ہیں؟''میں نے ان سے

بحث نہیں کی بلکہ ان کا ہاتھ پکڑا اور ایک دروازے کے پاس لے گیا۔ میں نے کہا ''بیٹا اسے بند کیجئے''۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ میں نے کہا ''اس کی اوپر والی دونوں چٹخنیاں بند کریں۔ انھوں نے دونوں بند کیں۔ میں نے کہا 'اب ذرا جھک کر نیچے والی بھی بند کر دیں''۔ انھوں نے بلا چون و چرا وہ بھی بند کر دی۔ میں نے کہا اب ذرا دروازے کو دھکا لگا کر دیکھیں کہ کس قدر مضبوطی سے بند ہو چکا ہے۔ انھوں نے دھکا لگایا اور کچھ زور آزمائی بھی کی لیکن دروازے میں ذرا سی بھی حرکت پیدا نہ ہوئی میں نے کہا چور کیا چور کا باپ اسے نہیں کھول سکتا یہ ہے چوری کا سد باب اور چوروں سے بچاؤ کا طریقہ! انھوں نے بے ساختہ کہا ''بجا فرمایا آپ نے'' اللہ الحمد میرے داماد کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔

ایک آدمی کے ہاتھ میں مسواک یا ٹوتھ برش ہے۔ اس نے پانی کی ٹونٹی کھول کر کلی کی اور دانتوں کی صفائی شروع کر دی۔ اس عمل کے دوران میں ٹونٹی کھلی رہتی ہے اور بالٹیوں کے حساب سے پانی نکل کر ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک غفلت ہے اس کا ازالہ کیجئے۔ اور دوسروں کو بھی سمجھائیے۔ پانی صرف اس وقت کھولیں جب آپ نے کلی کرنی ہو یا ہاتھ منہ دھونا ہو۔ مسواک اور برش کرتے ہوئے پانی کو بند رکھیں۔ اگر آپ پانی کا بل بھی ادا کرتے ہیں تو آپ کو پانی کا یہ ضیاع فوراً بند کر دینا چاہیے۔

وضو کرتے ہوئے بھی اس احتیاط کو ملحوظ رکھیں۔ اعضائے وضو کو تین بار دھو لینا کافی ہے۔ اس سے زیادہ پانی کا استعمال شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے۔ فقہائے کرام نے پانی کے اسراف سے منع کیا ہے۔

بجلی کے بل حد سے زیادہ آنے لگے ہیں میں نے اور میرے اہل خانہ نے طے کر لیا ہے کہ بجلی کی اشیاء بقدر ضرورت استعمال کی جائیں اور جب ضرورت پوری ہو جائے تو بجلی کے سوئچ آف کر دیے جائیں۔ چنانچہ جب میں کمرے سے باہر نکلتا ہوں تو بلب اور پنکھا بند کر دیتا ہوں۔ اور بچوں کو بھی تاکید کر دی ہے کہ کمرے سے نکلنے والا آخری شخص پنکھے اور بلب بند کر دیا کرے ہم رات کے وقت بھی دو تین ضروری بلبوں کے سوا باقی تمام بلب بند کر کے سوتے ہیں۔ اگر آپ کو ہماری یہ چھوٹی چھوٹی احتیاطی تدبیریں پسند آئیں تو آپ بھی انہیں اپنا لیجیے ان کے فائدے سمیٹے اور نقصان سے بچیے.....صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!۔☆☆

''تلخیص البیان''، ایک اہم تفسیری کاوش

مولانا مفتی محمد حنیف خالد

سرورکونین حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سب سے عظیم الشان اور قیامت تک زندہ رہنے والا معجزہ قرآن کریم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سب سے بڑا انعام ہے۔قرآن مجید تمام کتب سماویہ،صحف سابقہ اور جملہ انبیاء ورسل کے علوم کا جامع ہے،مسلمانوں کی سعادت کا اصلی سرمایہ قرآن پاک ہے،سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا کہ:"اگر سب آدمی اور سب جن مل کر بھی ایسا قرآن لانا چاہیں تو ایسا نہیں لاسکتے اگرچہ ان میں سے ہرایک دوسرے کا مددگار کیوں نہ ہوں"۔

جس دن سے قرآن کریم کا نزول دنیا میں ہوا ہے اسی وقت سے ہرزمانے اور ہرعلاقے کے علماء کرام حسب استطاعت قرآن کریم کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں بلکہ اپنی زندگیاں اس میدان میں وقف کرتے رہے ہیں، مفتئ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم ختم کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو اس لائق ہے کہ اپنی زندگیاں اس میں ختم کی جائیں۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ بھی ان عظیم شخصیات میں شامل تھے۔۔جنہوں نے قرآن کریم کی خدمت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنارکھا تھا۔حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی بھر لاہور میں درس قرآن کریم کے مبارک سلسلے کو جاری رکھا جس سے تقریباً تمام شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد نے استفادہ کیا۔چالیس برس میں آپ نے پانچ ہزار علماء کو قرآن پاک کی تعلیم دی۔حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا تحریرفرمودہ ترجمہ قرآن کریم اپنی بہترین افادیت ونافعیت کی بنیاد پر اہل علم اور عامۃ الناس،دونوں طبقوں میں خوب مقبول ہوا، ترجمہ بہت ہی بامحاورہ اور مطلب خیز ہے،حاشیے میں ربط آیات اور خلاصۂ رکوع کے مندرجات بھی بہت عمدہ ہیں۔

شروع میں مختلف ابواب وموضوعات کے تحت مرتب کی گئی آیات کی فہرست بھی قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بے حد مفید ہے۔درحقیقت یہ ایسا ترجمہ قرآن کریم ہے جس کی نافعیت کا صحیح اندازہ وہی حضرات لگاسکتے ہیں جنہوں نے بنظر غائر اس کا مطالعہ کیا ہے۔

استاذ محترم حضرت مولانا محمد زاہد انور صاحب مدظلہم (مہتمم جامعہ عثمانیہ شورکوٹ شہر) حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک سلسلے سے وابستہ ہیں، آپ نے حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا شرف بھی حاصل کیا ہے اور حضرت مرحوم کے تفسیری معارف سے بھی فیضیاب ہیں ۔اس لئے شروع ہی سے حضرت استاذ محترم کو قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر سے خاص شغف رہا ہے اور آپ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہونے والے خاص ذوق کے تحت طلبہ کو تفسیر کا درس دیتے رہے ہیں، حضرت استاذ محترم کے ذہن میں عرصۂ دراز سے یہ شوق پرورش پارہا تھا کہ کسی طرح وہ بھی قرآن کریم کی خاص انداز سے تفسیری خدمت کر کے دنیا میں ذہنی سکون اور آخرت میں اجروثواب حاصل کرنے والوں میں شامل ہو جائیں۔

چنانچہ اسی داعیہ اور ایک مبشرۂ صالحہ کے پیش نظر حضرت الاستاذ نے ترجمہ حضرت لاہوریؒ ہی کو بنیاد بنا کر اس میں درج ذیل قیمتی اضافے فرمائے ہیں:

۱..... ہر ہر آیت کے نمبر کے مطابق تمام آیات کے مفہوم کا خلاصہ بہت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اس طرح تحریر کیا ہے کہ جس سے اس آیت کا معنی ومطلب واضح ہو گیا ہے، نیز اس آیت کا اصل مقصد ومنشاء بھی کھل کر سامنے آ گیا ہے۔قرآن کریم کی یہ خدمت ایسی ہے کہ اس کے لئے حضرت الاستاذ نے اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے بہت زیادہ محنت وعرق ریزی برداشت کی ہے، یہ اسلوب اگرچہ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ میں پہلے سے موجود ہے مگر اس میں صرف ہر رکوع کے آغاز میں اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ ہر ہر آیت کا خلاصہ بہت ہی اختصار کے ساتھ سپرد قرطاس کرنا یقیناً نیا اسلوب ہے جس سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ اس آیت میں کیا خاص بات بیان کی گئی ہے۔

۲.....قرآن کریم کی سورتوں اور مختلف آیات کی روشنی میں قرآن کریم کے ایک سو دس منتخب مضامین پر بہت ہی جاندار اور وقیع کلام کیا گیا ہے جو بہت اہمیت کا حامل ہے۔ان منتخب مضامین میں سے بعض تو ایسے ہیں جو مستقل مقالہ کی شکل اختیار کر گئے ہیں، جن میں عصر حاضر کے اشکالات اور ان کی بنیاد بننے والے فلسفوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جس کا مطالعہ کرنے سے بہت سے عقلی ووہمی شبہات ووساوس کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں:

صداقتِ قرآن کا ابدی چیلنج۔نظریاتی وتہذیبی اختلاف کے فکری نتائج۔عالمی معاشی وباء (مسئلۂ ربوٰ، سود) بین المذاہب مکالمہ۔اسلام کا نظام عفت وپاکدامنی۔وکالت باطلہ وصحیحہ اور شہادتِ حق۔حیران کن سائنسی ترقی پر اٹھتا ہوا سوال۔مشروط امن معاہدے، اسلام کی دفاعی وخارجہ پالیسی۔اختلاف رائے اور آزادئ رائے۔فضول شاعری

اور با مقصد افکار۔عورت کی حکمرانی پر پہلی احتجاجی آواز۔۔ایک پرندے کی طرف سے۔

۳.....حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے طرز پر مزید دوسو پچہتر اہم مضامین قرآن کی نشاندہی (آیت نمبر، پارہ اور سورت کے حوالے کے ساتھ) کی گئی ہے، یہ کوشش بھی اتنی مفید اور نافع ہے کہ صرف ان عنوانات پر غور کر لینے سے ہی قرآن کریم کی تقریباً تمام آیات کا خلاصہ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔اس طرح کے چند عنوانات یہ ہیں: شرک اور دہریت کی تردید کا ذکر۔یہود کی بدترین اسلام دشمنی کا ذکر۔تبرکات سلف کا ثبوت۔حدیث کی اہمیت وضرورت کا بیان زکوٰۃ فلاح اور تزکیہ کا سبب ہے۔اسقاط حمل کے ناجائز ہونے کا ضمنی ثبوت، ناجائز دولت جمع کرنے کی مذمت۔

سورۂ والناس کے بعد بھی اہم مضامین شامل کئے گئے ہیں جن میں سب سے اہم مضمون وہ ہے جس میں آیات کے حوالے کے بغیر پورے قرآن مجید کے اہم مضامین کا مستقل تذکرہ کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے،" کوئی حد ہے قرآنی معارف وعلمی خزائن کی"،اس میں بھی انتہائی اختصار کے ساتھ قرآن کریم کی آیات کے ضمن میں بیان کئے گئے معانی واحکام کا استیعاب کیا گیا ہے۔ "تحقیق محمود از افادات محمودؒ" کے عنوان سے حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری افادات بھی کتاب کا حصہ ہیں جن میں تفسیر بالرائی، شان نزول، ربط آیات، ناسخ منسوخ، جیسے مباحث بیان کئے گئے ہیں۔حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے ساتھ ساتھ قرآن مجید سے متعلق مفید معلومات بھی قابل قدر ہیں، ایک اہم بات یہ ہے کہ زیر نظر تفسیری کاوش "تلخیص البیان" کے ذریعے حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ قرآن کریم بھی حضرت مولانا میاں محمد اجمل قادری صاحب مدظلہم کی اجازت سے شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے جس کا اہل علم کو طویل عرصے سے شدید اشتیاق تھا۔حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا فہم دین کے حوالے سے خصوصی نقطۂ نظر اور فکر محمودؒ بھی شامل اشاعت ہے۔

ہماری رائے میں زیر نظر کتاب قرآن کریم کی بہت ہی مفید خدمت ہے، جس میں دور حاضر کے پیدا کئے گئے ذہنی خلجانات کو قرآن مقدس کی روشنی میں عمدگی کے ساتھ دور کیا گیا ہے، نیز کتاب اللہ کے مضامین کو جامع نظام الٰہی، کامل دستور العمل اور عالمی آئین الٰہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔طباعت دلکش، کاغذ عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔اہم مضامین کے اضافے کے ساتھ تیسرا ایڈیشن دو جلدوں میں دستیاب ہے۔مدارس کے اساتذہ کرام، طلبہ، فضلاء وفاضلات نیز ائمہ وخطباء کے لئے یہ عمدہ علمی تحفہ ہے جس کی کما حقہ قدردانی کی جانی چاہئے۔

آخر میں دل سے دعا ہے کہ مولائے کریم حضرت الاستاذ مدظلہم کی اس جدوجہد کو اپنی بارگاہ میں قبول ومنظور فرما کر اسے آپ کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔آمین۔

تبصرے کے لیے دو کتابیں بھیجنا لازمی ہے
کتابیں مرکزی دفتر کے پتے پر ارسال کیجیے

نقوش اسلام

تالیف: شیخ الحدیث مولانا زبیر احمد صدیقی۔صفحات:464۔طباعت عمدہ۔ ملنے کا پتا: مکتبہ رشیدیہ جامعہ فاروقیہ شجاع آباد۔رابطہ نمبر:0322-6102570

حضرت مولانا زبیر احمد صدیقی زید مجدہم جید استاذ الحدیث اور صاحب قلم وقرطاس آدمی ہیں، خطیب بھی اعلیٰ پائے کے ہیں۔ اپنے مدرسہ کی انتظامی اور تدریسی مصروفیات کے باوصف قلم سے رشتہ بھی مضبوط ہے، آپ کی ادارت میں ایک وقیع ماہنامہ بھی مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب نقوش اسلام آپ کے علمی، دینی، اصلاحی اور تربیتی مضامین کا عمدہ مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ تین ابواب پر مشتمل ہے: باب اول ''سیرت ومتعلقات سیرت'' پر مشتمل ہے، جس میں پندرہ مضامین شامل ہیں، دوسرا باب ''اخلاق واعمال'' کے عنوان سے ہے، جس میں بیس مضامین شامل ہیں، باب سوم ''بحث ونظر'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں اکیس مضامین شامل ہیں۔ آپ کے عمومی نوعیت کے مضامین بھی خصوصیت کا درجہ لیے ہوتے ہیں، بعض ایسے مضامین بھی ہیں جن پر عام طور سے قلم نہیں اٹھایا جاتا، ان پر بھی آپ نے دادِ قلم دی ہے اور موضوع کا حق ادا کیا ہے، مثلاً ''مروجہ نعت خوانی، چند قابل اصلاح پہلو''، ''کیا پیری مریدی شریعت سے مبرا ہے؟''، ''تقسیم وراثت میں شریعت سے انحراف اور اس کے دنیوی واخروی نقصانات''، ''چار شادیوں کا تاریخی، شرعی اور معاشرتی جائزہ۔''، ''غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی شرعی حدود''۔ وغیرہ۔ دیکھا گیا ہے کہ بسا اوقات مضامین وقت کی رفتار میں گم ہو جاتے ہیں، مگر ''نقوش اسلام'' میں شامل تمام مضامین ہمیشہ زندہ رہنے والے مضامین ہیں جن کی تازگی وتابانی کبھی ماند نہیں پڑے گی۔

کتاب کے آغاز میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم، ناظم اعلیٰ وفاق حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم کی تقریظات شامل ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم رقمطراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے انہیں تدریس اور خطابت کے علاوہ حسن تحریر سے بھی نوازا ہے۔ ان کے اندازِ تحریر میں پختگی، سلاست اور شگفتگی جلوہ افروز نظر آتی ہے، جستہ جستہ بعض مضامین سے لطف اندوز ہوا۔ جن میں سلامت فکر اور افادیت خوش بیانی کے ساتھ گندھی ہوئی نظر آئی، باقی مضامین کے بارے میں بھی یہی امید ہے۔ اللہ تعالیٰ اس

مجموعے کو نافع اور سبق آموز بنائیں اور یہ بارگاہ الٰہی میں مقبول ہو۔آمین!‘‘

ایک عالی مرتبت شخصیت کے ان الفاظ کے بعد کتاب بارے ہمارا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

نقوش علم

تالیف: شیخ الحدیث مولانا زبیر احمد صدیقی۔صفحات 624۔طباعت: عمدہ۔ ملنے کا پتا: جامعہ فاروقیہ، پرانا ملتان روڈ شجاع آباد۔رابطہ نمبر 03004396067۔

یہ کتاب بھی شیخ الحدیث مولانا زبیر احمد صدیقی زید مجدہم کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کے بھی تین باب ہیں۔ پہلے باب میں دروس قرآن شامل ہیں۔ دوسرے باب میں دینی مدارس پر لکھے گئے گرانقدر، علمی اور معلوماتی مضامین شامل ہیں، ان میں سے زیادہ تر کا رُوئے سخن گزشتہ ایک عشرہ سے دینی مدارس کے خلاف برپا سازشوں کی جانب ہے۔تیسرا باب معروف دینی شخصیات پر تعزیتی سوانحی اور تاثراتی مضامین سے عبارت ہے۔اس مجموعہ میں کل ایک سو سولہ مضامین شامل ہیں۔ تینوں حصے ہی دلچسپی کا باعث ہیں، ہر تحریر دامن دل می کشد جا اینجا است کا مصداق ہے۔ دروس قرآن جیسے علمی مضامین کے بعد دینی مدارس کے حوالے سے لکھے گئے مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ان مضامین میں تحفظ و دفاع دینی مدارس اور حکومتوں کی مدارس کے ساتھ ریشہ دوانیوں، استبدادی شکنجوں میں کسنے کی پالیسیوں اور دینی مدارس کو حکومتی کنٹرول میں لینے کے ہتھکنڈوں کا ذکر اور دفاعی حکمت عملی کا تذکرہ ہے۔اہل مدارس کے لیے یہ حصہ خاص دلچسپی کا حامل ہے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

مولف و مرتب: مولانا محمد اکبر شاہ بخاری۔صفحات: 736۔طباعت: عمدہ۔ قیمت: لکھی نہیں۔ ملنے کا پتا: مکتبہ رحمانیہ، غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور۔رابطہ نمبر: 042-37224228

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے اکابر دیوبند میں وقیع شان رکھنے والے بزرگ تھے۔حضرۃ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف کے شناور اور شارح تھے۔مسندِ علم کے شہ نشین تھے۔آپ کی شخصیت اپنے کمالات اور خصوصیات میں ایک امتیازی شان اور عظمت کی حامل تھی۔علم و فہم، تدبر و حکمت اور فتویٰ و طہارت کے پیکر تھے۔گرامی قدر مولانا محمد اکبر شاہ بخاری دام ظلہم نے شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و خدمات پر یہ حسین گل دستہ ترتیب دیا ہے۔اس کتاب کے دو حصے ہیں، حصہ اول میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت و تعلیم، تدریسی، علمی، تصنیفی، خطابتی اور سیاسی زندگی کی بھر

پورعکاسی کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات وخدمات پر مشاہیر اہل علم وقلم کے گرانقدر مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ ان میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا قاری محمد طیب قاسمی، مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، علامہ محمد یوسف بنوری، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے کبار علماء کے مضامین بھی شامل ہیں۔ مجموعی طور پر تقریباً ستر کے قریب مضامین اس حصے میں ہیں۔ آغازِ کتاب میں حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ کے قلم سے ''پیش لفظ'' ہے، جب کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، علامہ خالد محمود رحمہ اللہ مولانا ڈاکٹر محمد اسعد تھانوی، مولانا محمد ازہر، مولانا مفتی عبدالقدوس ترمذی، مولانا فضل الرحیم اشرفی اور کئی دیگر اکابر علماء کی تقریظات شامل ہیں۔ کتاب کی ترتیب وتسوید عمدہ ہے۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات وخدمات کا تقاضا ہے کہ یہ کتاب ہر صاحب ذوق کی لائبریری کی زینت بنے۔

شذرات

مصنف: شاد مردانوی۔ صفحات: 224۔ طباعت: عمدہ۔ قیمت: 800 روپے ملنے کا پتا: مصطفیٰ پبلی کیشنز 0346-3080106

ادب جاہلی میں ''سبعہ معلقات'' کو لافانی مقام حاصل ہے۔ اس بات کا حقیقی ادراک وہی شخص کرسکتا ہے جس کی ادب جاہلی پر گہری نگاہ ہو۔ ''سبعہ معلقات'' درس نظامی میں شامل ہے اور اس کی متعدد اردو شرحیں بازارِ کتب میں دستیاب ہیں۔ ''شذرات'' بھی اگرچہ انہی میں سے ایک شرح ہے مگر اپنے لہجے اور اسلوب کے اعتبار سے بہت منفرد بھی ہے۔ اس کی ایک انفرادیت تو یہی ہے کہ شرح کرنے والے فاضل درس نظامی ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں، عربی ادب کے ساتھ اردو ادب پر بھی دسترس ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کچھ امراء القیس والی بیبا کی، جراءت اور فصاحت بھی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے معلقات کے اشعار کی ایسی شرح کی ہے کہ نہ صرف اشعار و الفاظ کی درست تفہیم ہوجاتی ہے بلکہ معنیٰ ومطالب بھی چشم تخیل میں مجسم ہوکر سامنے آجاتے ہیں۔ جا بجا استشہاد میں جدید وقدیم اردو شعراء اور کئی مقامات پر اپنے اشعار بھی پیش کرتے ہیں۔ اس اسلوب نے زیر نظر شرح کو دلچسپ بنادیا ہے۔ طباعت میں نفاست برتی گئی ہے۔ امپورٹڈ سفید کاغذ پر کتاب شائع کی گئی ہے۔ اہل ذوق کے لیے عمدہ کاوش ہے۔